TIGHT BINDING BOOK

THE BOOK WAS DRENCHED

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222536

UNIVERSAL
LIBRARY

از زمیں تا بہ آسماں سخن است

عرش و فرش

جوشؔ ملیح آبادی

سنہ ۱۹۴۴ء

کتب خانہ تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی ۳

طبع اوّل سنہ ۱۹۴۴ء

تعداد ایک ہزار

مطبوعہ یونائیٹڈ فائن آرٹ لیتھوگرافرز، جوگاؤں، بمبئی ۱۱

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	بنام قوت وحیت	۵
۲	عدالتِ حسن	۱۱
۳	ایک پرانی غزل	۱۳
۴	پرانی یادیں	۱۵
۵	نامکمل خاکے	۱۶
۶	یارِ سادہ	۲۹
۷	ادائے سلام	۳۲
۸	صبح شاعر	۳۳
۹	جوابِ شاعر	۳۴
۱۰	آہ لکھنؤ	۳۸
۱۱	نوجوانی کی ایک رات	۴۱
۱۲	بڑھاپے کی پہچان	۴۶
۱۳	آدمی نامہ	۵۰
۱۴	لاعلاج تاخیر	۵۸
۱۵	شش و پنج	۶۱
۱۶	ظلمت کی تمنا	۷۲
۱۷	اُترا ہوا چہرہ	۷۷
۱۸	دریوزۂ التفات (ا)	۸۳
۱۹	دریوزۂ التفات (ب)	۸۵
۲۰	بشارت	۸۷
۲۱	فطرتِ اقوام [illegible]	۹۰
۲۲	وعدہ فراموشی	۹۲
۲۳	سونی جنت	۹۴
۲۴	تعاقب	۱۰۰

۲	تقلید و تحقیق	۱۰۷	۳۹	عروس البلاد بمبئی	۱۶۷
۲۰	ہاں یاد کر سحر	۱۰۹	۴۰	سراب	۱۶۹
۲۰	اے من کاہے تو گھبرائے	۱۱۱	۴۱	عورت	۱۷۳
۲۰	جنوں تیرا پھر رہا ہے فضا میں	۱۱۵	۴۲	یاد کر	۱۷۴
۲۰	زندگی کے دوزخ	۱۲۱	۴۳	کشود کار	۱۷۵
۳	اے رحمتِ یزداں	۱۲۷	۴۴	اہلِ ملیح آباد سے	۱۷۶
۳۱	یہ امیروں کے مصاحب . . .	۱۳۱	۴۵	ارباب ادب ہوشیار . . .	۱۷۸
۳۲	آزردگیٔ بے سبب . . .	۱۳۶	۴۶	چہرۂ برافروختہ	۱۷۹
۳۲	سفاکِ رحم	۱۳۸	۴۷	ایک بے چین رات	۱۸۰
۳۴	اے دِل	۱۴۰	۴۸	محبت کی زبان	۱۸۲
۳۵	آخری تمنّا	۱۴۲	۴۹	کارل مارکس	۱۸۵
۳۶	ہولناک تبدیلی	۱۴۷	۵۰	سحاب سرود	۱۹۱
۳۷	اے وائے آدمی	۱۴۹	۵۱	رباعیات	۱۹۵
۳۸	مرگِ نو	۱۶۴	۵۲	آوارہ خیالات	۲۴۵

بنامِ قوّت و حیات

نظامِ نو:

کھیل، ہاں اے نوعِ انساں، اِن سیہ راتوں سے کھیل
آج اگر تُو ظُلمتوں میں پا بہ جولاں ہے تو کیا
مسکرانے کے لئے بیچین ہے صُبحِ وطن
اور چندے ظُلمتِ شامِ غریباں ہے، تو کیا
چل چکی ہے پیشوائی کو نسیمِ باغِ مصر
آج یُوسف مُبتلائے چاہِ کنعاں ہے تو کیا
اب کھُلا ہی چاہتا ہے پرچمِ بادِ مُراد
آج ہستی کا سفینہ وقفِ طُوفاں ہے تو کیا

اُٹھنے والی ہے نگارِ صبحِ درماں کی نقاب
آخرِ شب زحمتِ دردِ فراواں ہے، تو کیا

ختم ہو جائے گا کل یہ ناروا پست و بلند
آج ناہموار سطحِ بزمِ امکاں ہے تو کیا

کھل رہی ہے خندۂ گیتی کی زُلفِ خم بہ خم
اِس کُرے پر آج دامِ چشمِ گریاں ہے تو کیا

آ گئیں دِل سے تبسم کی شعاعیں تا بہ لب
اشکِ خوں آلود اگر عنوانِ مژگاں ہے تو کیا

کل اِسی موجِ نفس میں رقص فرمائے گا لحن
آج آہوں سے اگر یہ تار لرزاں ہے تو کیا

مُٹھیوں میں بھر کے افشاں چل چکا ہے انقلاب
ابرِ غم، زُلفِ جہاں پر بال جنباں ہے تو کیا

بُلبُلِ دانش، پر افشاں ہے چہکنے کے لئے
آج مُرغِ وہم، ذہنوں میں غزلخواں ہے، تو کیا

راہ میں ہے کارواں تشکیک اور تحقیق کا
آج اگر نادانی تسلیم و ایقاں ہے تو کیا

ختم ہونے پر ہے تبلیغِ روایات و رسوم
آج اگر تفسیرِ حکمت، جُرم و عصیاں ہے تو کیا

نصب ہونے ہی پہ ہے میزانِ دیدار و دلیل
حُکمراں اِس وقت اگر بالغیب اِیماں ہے، تو کیا

کل عجائب خانہ ہوگا اور یہ پیرِ مُردہ سر
آج اگر منبر پہ شیخ "پاک داماں" ہے، تو کیا

منزلیں طے کر چکا ہے آفتابِ فکرِ نو
آج اگر رُوحِ قدامت ظلمت افشاں ہے، تو کیا

کل یہی "بندہ" "الوہیت" سے ہوگا شاد کام
آج اگر بُہتانِ عبدیت پہ نازاں ہے، تو کیا
ناز کی محراب میں جلنے پہ ہے شمعِ نیاز
بر سرِ جنگ آج اگر لیلائے دوراں ہے تو کیا
کل جواہر سے گراں ہوگی لہو کی بُوند بُوند
آج اپنا خُون، پانی سے بھی ارزاں ہے، تو کیا
جانور کا جانور بھی کل نہ ہوگا مُدعی
آج اگر انساں کا انساں، دُشمنِ جاں ہے، تو کیا
کھُل رہا ہے وحدتِ اقوامِ عالم کا عَلَم
آج انساں، مُنکرِ توحیدِ انساں ہے، تو کیا
سایہ افگن ہے ہیولیٰ، برقِ ایواں سوز کا
آج صرفِ باغِ سُلطاں، خُونِ دہقاں ہے، تو کیا

آسماں کو روندنے والی ہے بالآخر زمیں
آسماں آج اِس زمیں پر آتش افشاں ہے، تو کیا

بن رہا ہے صرصر و سیلاب خونِ ہاشمی
آج ابوسفیاں کے گھر میں چراغاں ہے، تو کیا

آ رہی ہے آگ، لنکا کی طرف بڑھتی ہوئی
آج راوَن کا محل سیتا کا زنداں ہے، تو کیا

آ چکا ہے رونقِ فردا کا جنبش میں جلوس
آدمی کا خانۂ امروز ویراں ہے، تو کیا

دستِ غم خواری میں ہو گی کل زمامِ آب و ناں
آج اگر نامہربانی میرِ ساماں ہے، تو کیا

ہو رہا ہے طبعِ فرمانِ حیاتِ جاوداں
قوت اگر اب تک رگِ جاں پر خراماں ہے، تو کیا

سینۂ خیاطِ عالم میں ہے طرحِ رختِ نو
آج اگر سلمائے ہستی چاک داماں ہے، تو کیا
جوش کے افکار کو مانے گی مستقبل کی روح
آج اگر رسوا یہ مردِ نامسلماں ہے، تو کیا!

عدالتِ حُسن :——

پھر اُن کو ہے ذوقِ عدالت پناہی
مبارک ہو اے جذبۂ دادخواہی
خوشا قسمتِ عصمتِ دِل، کہ مجھ پر
نہ ثابت ہوئی تہمتِ بدنگاہی
مری سمت سے پیشِ صبحِ درخشاں
شبِ غم نے دی کتنی بہتر گواہی
ہوا فیصلہ پھر کہ میرے لئے ہیں
نواہی ، اوامر — اوامر، نواہی

پھر اجلاسِ قاضیِ حسنِ جواں میں
مُسلّم ہوئی عشق کی بے گناہی
پر افشاں ہے یا نگِ مسرت فضا میں
غزلخواں ہے بیتے دِنوں کی گواہی
سر، اس کا ہے، اَور مُجھ گدا کے قدم پر
کہ ٹھوکر ہے جس کی مجھے تاجِ شاہی
پھر اعلانِ معزولیِ شامِ حرماں
ہوا زیرِ مِنبر صبح گاہی
اِدھر مڑ کے چشمِ عنایت نکرنا
کہ اِس وقت شاداں ہے شاعر الٰہی
اس افراطِ حکمت پہ بھی جوش مجھ میں
وُہی بانکپن ہے، وُہی کج کُلاہی

ایک پرانی غزل[1] (سنہ ۱۹۳۰ء)

عقل کی جَرّاح سے اُڑنے جو لگے عشق کے ہوش
حُسن اُٹھا ناز سے اِمداد یہ دیوانوں کی

تم مری ہمت نہ دیکھو کہ مرے چہرے پر
آرزو کی ہے شکن، لہر ہے ارمانوں کی

اے حرم خواب سے بیدار ہو، ایماں ہشیار
عشق زنجیر ہلاتا ہے صنم خانوں کی!

بس بس اے مُطربِ نوخیز خدارا خاموش
مَوج اُٹھتی ہے مرے خُون میں طوفانوں کی

مُسکراتے ہوئے یُوں آئے وہ مے خانے میں
رُک گئی سانس چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

[1] میرے قدیم دوست حکیم آشفتہ لکھنوی نے مجھ سے یہ غزل عین شاعرے کے وقت کرنے میں بنا

الاماں حضرتِ آشفتہ کی آشفتہ سری
کھینچ لائے مجھے محفل میں غزل خوانوں کی

پُرانی یادیں

دِل سے اُٹھتا ہے دُھواں، دہر پہ چھا جاتا ہے
ہائے وہ وقت جب اپنے پہ ترس آتا ہے

دِل بہلنے کا نکلتا ہے جو پہلو کوئی
کیا قیامت ہے کہ دِل اور بھی گھبراتا ہے

جھومتی جب کبھی اُٹھتی ہے گھٹا قبلے سے
اپنی بیتی ہوئی راتوں کا خیال آتا ہے

دیکھتا ہوں جو سرِ راہ جنازے کا جلوس
دِلِ انساں کی تمناؤں پہ رحم آتا ہے

جوشِ ہر سانس میں دِل بیٹھ رہا ہے میرا
ہائے کیا قصرِ طرب رنگ ڈھا جاتا ہے

نامکمل خاکے

(۱)

پئے تفصیلِ حُسنِ ساعقہ بار
آج جُنباں ہے یُوں لبِ گفتار

ساحلِ بحرِ پُر حبابوں کا
گوندھنا چاہتا ہُوں گویا ہار

یا کلی سے اُٹھانے بیٹھا ہُوں
شبنمِ تازہ کے دُرِ شہوار

الحذر وہ نگارِ دہر فگن
الاماں وہ بتِ اِلہ شکار

(۲)

چست و چالاک و چاق و چابک دست
مست و مدہوش و سرخوش و سرشار
گل رُخ و مہ جمال و آئینہ رُو
نورَس و نرم و نادِرہ گفتار
تیز و طرّار و تُند و تاب رُبا
شوخ و شنگ و شریر و شعبدہ کار
زرفشاں، مشک ریز، مے کدہ ساز
گُل چکاں، مے فروش، زمزمہ بار
مہ گسُل، مہر سوز، نجم شکن
شمعِ یوسف گداز و حور آزار

شبنمستان بدوش و خلد بکف
غنچگی بر رخ و چمن بکنار

طرفہ افسونِ دیدہ و مژگاں
زندہ اعجازِ کاکل و رخسار

آفتِ زاہدانِ گوشہ نشیں
فتنہ عابدانِ شب بیدار

شامِ عشرت، بہ عشوۂ خوں ریز
صبحِ صحبت، بہ نرگسِ بیمار

محرمِ رازِ شوخیٔ و تمکیں!
ساحل و موج خفتہ و بیدار

(۳)

زلف ظلمات چشمۂ حیواں
رخ شبِ ماہ خانۂ خمار

چہرہ، تفسیرِ اسمِ شمس و قمر
چشم، تعبیرِ خوابِ جام و خمار
گفتگو، نہرِ تنگیٔ اندک
خامشی، بحرِ وسعتِ بسیار
لعلِ شیریں و چشمِ روشن میں
موجِ نعمت و گردشِ انوار
سوگوار نہ خال و خد پہ سرور
عاجزانہ جمال میں پندار
کس تناسب سے رخ پہ ہم آہنگ
آبِ اقرار و آتشِ انکار
ابروؤں میں طلسمِ راز و نیاز
تیوروں میں فسونِ لیل و نہار

لب و رُخسار میں سموئی ہوئی
نرمیٔ صُلح و گرمیٔ پیکار
جُھکتی نظروں میں عاشقانہ کشش
اُٹھتی پلکوں میں آہُوانہ فرار

پاس سے زہر۔ دُور سے تِریاق
خلوت انکار و انجُمن اِقرار
خَمِ گردن، کہ قصۂ مینا
لبِ لعلیں، کہ داستانِ ہزار
وقتِ گفتار۔ اِک جواں گُل بانگ

دمِ رفتار ۔ اِک رواں گُل زار

ہر کنائے میں خُلد کے عُرفے

ہر اشارے میں مصر کا بازار

(۴)

متحرک تصورِ گل و مل
ذی نفس آرزوئے سرو و چنار

کانپتی چاندنی سرِ دریا
دوڑتی روشنی سرِ کہسار

لڑکھڑاتی شمیم شامِ خنک
رسماتی نسیمِ صبحِ بہار

گنگناتا خیالِ تاجِ محل
مسکراتی مرادِ شالامار

(۵)

دھنکے سونے کا آبشار کہ زلف
کھلتے بیلے کی چاندنی کہ عذار

نازنینوں کی صدرِ بزم افروز
مہ جبینوں کی قافلہ سالار
سپہِ خاکیانِ حلقۂ خاک
اُس کے دربار میں عصا بردار
لشکرِ نوریانِ عالمِ پاک
اُس کے جلوؤں سے نقش بر دیوار

(۶)

شوخیوں کی وہ دھوم رگ رگ میں
جیسے باراں میں جھومتے اشجار
چشم و رخسار یوں تجلّی ریز
جس طرح شیشہ ہائے تاب گذار

رُوئے گُل ریزیوں عرق آلود
جیسے پھُولوں پہ بُوندیوں کا نکھار
یُوں اُمنگوں کا رقص آنکھوں میں
جیسے ساغر میں ثابت و سیّار
نور و ظُلمت کی عشوہ کاری سے
یُوں دلآویز کاکُل و رُخسار
جیسے گوکُل کی شام کا رُومان
جیسے گنگا کی صُبح کے انوار
یُوں تبسّم میں ولوں کا ہجوم
جیسے شاہانِ ہند کا دربار
بات جیسے صدائے خندۂ گُل
چال جیسے خرامِ ابرِ بہار

گردشِ چشم و جنبشِ مژگاں

جیسے خوابوں میں رقص لیل و نہار

کُندنی چہرہ، اور سیہ ساری

جیسے کعبے پہ بارشِ انوار

سبزہ و گُل پہ وہ لطیف خرام

جیسے کوئی بجا رہا ہو ستار

نگہِ شوق سے وہ رُخ پہ حیا

جیسے شیشے کو چھو رہی ہو پھوار

پردۂ چشم میں نہاں یوں شوق

جیسے قندیل، نہر کے اُس پار

(۷)

موجِ انفاسِ خواب آگیں سے
یوں مچلتا ہوا گلے کا ہار
جیسے انوارِ صبح، گرمِ خرام
جیسے امواجِ بحر ناہموار

(۸)

صبح کے نقرئی دھندلکے میں
روئے ناشستہ پر وہ نیند نکھار
جیسے حافظ کی مست تانوں میں
کیف کا جوش، سرخوشی کا ابھار

(۹)

سُرخیِ جلد کے تموّج سے

یوں پریشاں، لباس کا ہر تار

جیسے گلشن میں آتشِ گُل کا

شبنم آلود جھٹ پٹے میں غبار

(۱۰)

لہجہ غلطیدہ جس طرح موتی

مرمریں فرش پر یمین و یسار

جیسے چینی پہ سکۂ رقصاں

اشرفی کی بلور پر جھنکار

(۱۱)

بات کرنے میں پینگ کا عالم

اتنی سُبکی سے، اَور بہ ایں ہنجار

جیسے فرقت کی چاندنی کے حضور

دِل میں تیرے کوئی مہین سی دھار

یا گُلِ تر کے سونگھنے کے وقت

جیسے سینے میں سانس کی رفتار

(۱۲)

حُسن کی شرح، غیر ممکن ہے

بند ہو بند، اے لبِ گفتار

ساحلِ بحر پر حبابوں کا
چاہتا تھا کہ آج گوندھوں ہار
اور کلی سے اُٹھانے بیٹھا تھا
شبنمِ تازہ کے دُرِ شہوار
نہ تو وہ ہوسکا، نہ یہ، صد حیف
ٹوٹ جا، خامۂ فضول نگار
نطق کے بس میں آ نہیں سکتی
بُوئے گل، تابِ ماہِ طلعتِ یار

یارِ سادہ (۱۹۴۴ء)

در آیا مرے تنگ خلوت کدے میں
بصد عشوہ کل شب کو وہ یارِ سادہ
ہر اک لیلیٰ عصر جس کی کنیزک
ہر اک راکبِ ناز جس کا پیادہ
سُبک جس سے پریوں کی ہر نسل رنگین
خجل جس سے حوروں کا ہر خانوادہ
زباں میں گھلاوٹ، نہ ہلکی، نہ بوجھل
نگہ میں لگاوٹ، نہ کم، نے زیادہ

سمٹتے ہوئے ابرُوانِ خمیدہ
مہکتی ہوئی کاکلِ تابدادہ
بہارِ گُل افشاں و ابرِ سُبک رَو
نگُوں سار، کمر بستہ، چہرہ کُشادہ
نظر سے ٹپکتی ہوئی صُبحِ بُستاں
جبیں پر مچلتی ہُوئی شامِ بادہ
لبِ لعل میں حرفِ پُرسش کی کاوش
نگاہوں میں عُذرِ جفا کا ارادہ!
بہ گیتی ترنّم، بہ گردوں تبسّم!
بُتِ ہند پروَردہ فردوس زادہ

جلو میں کمر بستہ رنگ و تجلی
چراغاں کی جیسے قطار ایستادہ
مسرت کے بندِ قبا کھل رہے ہیں
جلا ڈال اے جوشِ غم کا لبادہ

ادائے سلام

آنکھوں میں غُنچہ ہائے نوازش پنکھوڑ کر
میرے دلِ شکستہ کو نرمی سے جوڑ کر
ہونٹوں پہ نیم موجِ تبسّم کو توڑ کر
میری طرف خفیف سا گردن کو موڑ کر

کل صبح راستے میں، سُہانی حیا کے ساتھ
اُس نے مجھے سلام کیا کس ادا کے ساتھ

صُبح و شاعر

کہتا تھا خود کو، نامِ خُدا، تُو سحر پرست

اب میری بارگاہ میں آتا نہیں ہے جوش
جس جھٹپٹے نے تجکو سکھائے تھے زمزمے

اُس جھٹپٹے میں اب کبھی گاتا نہیں ہے جوش
کلیاں چٹک کے پھول بنیں، پھول ہنس پڑیں

اب اِس رَوِش سے باغ میں آتا نہیں ہے جوش
میری بہشتِ حُسن میں اپنی زبان سے

دریا لطافتوں کے بہاتا نہیں ہے جوش

آہستہ سے ہٹا کے دُھندلکے کی شبنمی
اب میرے فرشِ خواب تک آتا نہیں ہے جوش
یہ طرفہ سانحہ ہے کہ اب ایک عمر ہے
پہلی کرن کا تازہ جگاتا نہیں ہے جوش
بانگِ طیورِ جنبشِ بالِ نسیم سے
اب کیا ہُوا کہ ہوش میں آتا نہیں ہے جوش

جوابِ شاعر

شکوے ترے درست مگر اے نگارِ صبح
اب جوش، بزمِ ناز میں آئے تو کس طرح
پھنکتا رہے جو آتشِ غم سے تمام رات
وہ مُنہ اندھیرے عُود جلائے تو کس طرح

اُس طاق میں کہ جس میں جلاتا تھا شمعِ دل
اب دل تو کیا، چراغ جلاتا نہیں ہے جوش

چلتی ہے جب نسیم، مچلتی ہیں ڈالیاں
پودوں کو اب گلے سے لگاتا نہیں ہے جوش

حافظ کے شعر پڑھ کے، مری بارگاہ میں
اب مُنہ اندھیرے عُود جلاتا نہیں ہے جوش

زانو پہ فرقِ ماہ کو رکھ کر خیال میں
اب میری چاندنی کو سُلاتا نہیں ہے جوش

گردوں پہ دیکھتے ہی مرا لشکرِ جلوس
میداں میں جھومتا ہوا آتا نہیں ہے جوش

تاروں کی آنکھڑیوں میں ہیں آنسو بھرے ہوئے
پچھلے پہر اب اشک بہاتا نہیں ہے جوش

ہر آن آہِ سرد سے ہو جس کا سابقہ

موجِ صبا سے وجد میں آئے تو کس طرح

جس پر کثافتیں ہوں غمِ روزگار کی

دریا لطافتوں کے بہائے تو کس طرح

دُنیا میں جس کا نُوحہ بھی سُنتا نہ ہو کوئی

وہ بدنصیب شعر سُنائے تو کس طرح

طُغیانِ تیرگی میں جسے سُوجھتا نہ ہو

وہ طاقِ زر میں شمع جلائے تو کس طرح

بنتِ عِنب کے ساتھ جو جاگا ہو دیر تک

تکیئے سے جلد سر وہ اُٹھائے تو کس طرح

وہ آفتاب، رات گئے جو غروب ہو

قبلِ طُلوع جلوہ دکھائے تو کس طرح

آتش کی لوریوں سے سُلایا گیا ہو جو
ایسے کو آبِ چرخ جگائے تو کس طرح

جس کے جگر میں ہوں غم و خوشیں کی برچھیاں
پہلی کرن کا ناز بجائے تو کس طرح

پہلو اُجڑ چکا ہو جس آفت رسیدہ کا
زانو پہ چاندنی کو سُلائے تو کس طرح

گونجی ہوئی ہو جس کی رگ رگ میں ہائے ہائے
دھومیں تری فضا میں مچائے تو کس طرح

جو خشک آنسوؤں سے پیئے رات کو شراب
وہ جوش، صبح اشک بہائے تو کس طرح

آہ لکھنؤ

لکھنؤ! دیکھ، کہ ہیں کتنی پریشاں تجھ بن
یہ برستی ہوئی راتیں، یہ گرجتے ہوئے دن
کھائے جاتا ہے ترے شاعرِ بزمِ آرا کو
دھول پور، آہ جہاں ہے نہ کوئی اِنس نہ جن
ایسے بگڑے ہوئے چہروں پہ نظر پڑتی ہے
جن سے آتی ہے ترے رندِ خرابات کو گھن
اُن کو "کہنے کی جگہ کہنے ہیں ظالم" بن کو
اور "دُلہن" منہ سے نکلتی ہے بگڑ کر "دُلہن"

ایک "تارا" ہے، سو وہ ڈوب چکا ہے غم میں
اِک "بشمبھر" کہ جسے رات میسّر ہے، نہ دِن
اُسی مُڑتے ہوئے چھکڑے میں جُتا ہے اب تک
"تیری پھاٹی" کہ سدا سے ہے بقدرِ یک پن
ہائے اب "روپ" کو اب "روپ کے" ڈھونڈوں میں کہاں
کہ مری موت کا اعلان ۔ کِدھر ہے مُعلن؟
آدمی صبح کو بھی چلتے ہیں اَوندھے اَوندھے
مکھیاں رات کو بھی اُڑتی ہیں بھن بھن بھن بھن
گونجتی رہتی ہیں ناقوس و اذاں کی چیخیں،

ـه سید احتشام حسین ایم اے، پروفیسر لکھنؤ یونی ورسٹی ۔ شه ابوالکمال حضرت آسی امیٹھوی شه اسرار الحق مجاز بی اے علیگ

نہ تو مشرک ہی غنائی ، نہ سریلا مومن

احتشام آہ نہ موجود ، نہ امید و مجاز

کہ یہی چند ہیں اب صحبتِ شب کے ضامن

---

[۱] سردار تاراچند پرائیویٹ سکریٹری راناصاحب [۲] بابو شمبھر دیال کنیال انجنیئر [۳] بابو تیرتھ بھائی ریلوے انجنیئر ست [۵] سردار روپ سنگھ مرحوم ت

کو پستا جعفر[1] و قاسم[2] سے ملوں گا کس روز
اِس جگہ کوئی نجومی ہے نہ کوئی کاہن
کس کی آواز سنوں، کس کی تجلّی دیکھوں
نہ تو یارانِ موافق، نہ بُتانِ کم سن
لکھنؤ! کیا اسی مرگھٹ میں گذر جائیں گی
یہ برستی ہوئی راتیں، یہ گرجتے ہوئے دن؟

---

[1] میرزا جعفر حسین صاحب ایڈووکیٹ لکھنؤ [2] حکیم سید محمد قاسم صاحب عرف مہاجب عالم لکھنؤ

نوجوانی کی ایک رات

عجب نوجوانی تھی اپنی بھی پیارے
نہیں بھولنے کے وہ کافر نظارے
سُن اِک چاندنی رات کی بات مجھ سے
ابھی تک مرے دِل پہ چلتے ہیں آرے
وہ جادُو کے جھونکے، وہ آفسوں کی موجیں
وہ بیلے کے تختے ندی کے کنارے
وہ دہکے سے پھُول، اور وہ مہکے سے غنچے
وہ بانکا سا چاندا اور وہ چُبھتے سے تارے

فلک پر دمکتے ہوئے لالہ و گل
ندی میں جھلکتے ہوئے سنگ پارے

وہ حدِ نظر تک غزلخواں و رقصاں
دھڑکتے ہوئے دل کے ارمان سارے

وہ منظر۔ کہ شاید "خدا" پھر زمیں پر
صحیفہ کوئی آسماں سے اُتارے

وہ پہلو میں اِک سیم بر نوجوانی
بکاکل، سحابے، بعارض بہارے

بمژگاں، خدنگے، بہ ابرو، کمانے
بہ تمکین، خوابے، بہ شوخی، شرارے

اُسی طرح، رومان ہوتا ہے جیسے
برستی گھٹا میں ندی کے کنارے

جبیں پر گلابی پسینے کے قطرے
پسینے کے قطروں میں تابندہ تارے
تبسّم کی رَو میں اُمنگوں کی ہلچل
اُمنگوں کی ہلچل میں گنگا کے دھارے
جُھکے سے پپوٹوں میں وہ چشمِ تاباں
کوئی جیسے کاجل تکلّف سے پارے
وہ پلکوں کا سرشاریوں سے جھپکنا
لہُو میں اُمنگوں کے جیسے ترارے
لیئے مدبھری، اَدھ کھُلی انکھڑیوں میں
رَسیلے کنائے، کٹیلے اِشارے
رُخِ لالہ گوں میں مچلتے ہوئے سے
جوانی کے شعلے، جنُوں کے شرارے

لبِ جُو کبھی سیکڑوں پیچ و خم سے
تلاطم سے چلنا وہ سینہ اُبھارے
کبھی لیٹ جانا وہ کہنی کے بل پر
کبھی بیٹھ جانا وہ میرے سہارے
کبھی دیکھ کر مجھکو نرمی سے کہنا
"بڑے دُکھ میں رہتے ہیں شاعر بچارے"
وہ میرا یہ کہنا کہ گو بعدِ مدت
مگر تم مرے پاس آئیں تو بارے
بساطِ طرب پر، رگ و پے کے اندر
وہ میٹھی چبھن جس پہ دل جان وارے
وہ اک درد سا، فرطِ درماں کے باعث
وہ اک غم سا، بارِ مسرت کے مارے

وہ بھولا سا اک گیت، غلطاں فضا میں

"سجن آج آئے ہمارے دوارے"

جو اُس روز اے جوشؔ یوں جلوہ گر تھی

اُسے آج یوں کاش کوئی پکارے

کہ "ندّی اُمنڈ اور میداں ہے جل تھل

چلی آ لچکتی کنارے کنارے"

بڑھاپے کی پہچان

اگر دِن ہے خالی رجز خوانیوں سے
اگر رات کو نغمہ خوانی نہیں ہے
اگر آنکھ میں رَس نہیں آنسوؤں کا
اگر دِل میں سوزِ نہانی نہیں ہے
نہیں ہے اگر صبح کو ربِّ ارنی
اگر شام کو لَن ترانی نہیں ہے
ہر اِک شب، کسی تازہ عشرت کدے میں
اگر دعوتِ زندگانی نہیں ہے

اگر علم کی آگ کجلا چلی ہے
جہالت سے دل پانی پانی نہیں ہے
ہوائے ترنّم میں اوجِ فضا پر
اگر جذبۂ پرفشانی نہیں ہے
برستے ہوئے بادلوں کے دھوئیں میں
اگر رقص و رنگ و روانی نہیں ہے
مہکتی ہوئی خواب گاہوں میں جا کر
بہکتی ہوئی گل فشانی نہیں ہے
مچلتے لبوں، چلمنے مہ وشوں کی
اگر طاقتِ میزبانی نہیں ہے
اُبلتا ہوا ساغرِ لالہ گوں میں
اگر بادۂ ارغوانی نہیں ہے

اگر آتش زندگی کی لپٹ میں
حوادث کی ہر آگ، پانی نہیں ہے

اگر دن ہے محرومِ خود و زرہ سے
اگر شب کو پوشاک دھانی نہیں ہے

گناہوں کے بڑھتے ہوئے ولولوں کی
نظر سے اگر ترجمانی نہیں ہے

"فتوحات" کی سمت بڑھتا نہیں دل
عبادات سے آنا کانی نہیں ہے

نگارانِ ارض و بتانِ سمائیر
اگر ہمتِ حکمرانی نہیں ہے

حسینوں کے افسوں طلب جھرمٹوں میں
اگر ذوقِ افسانہ خوانی نہیں ہے

اگر شام کوئی نہیں ہے سلونی
اگر صبح کوئی سہانی نہیں ہے

اگر شادمانی ہے بے عنصرِ غم
غموں میں اگر شادمانی نہیں ہے

چھلکتے ہوئے ساغروں کی کھنک میں
دو عالم اگر اک کہانی نہیں ہے

تنوّع کے ایماء سے تھوڑے ہی دن میں
اگر ہر نئی شے، پرانی نہیں ہے

گذشتہ خطاؤں پہ ہے شرمساری
نئی وارداتوں کی ٹھانی نہیں ہے

تو پھر جوش، سوگندِ ربِّ تلاطم
وہ پیری ہے، پیری۔ جوانی نہیں ہے

آدمی نامہ

(۱)

گو رفعتوں میں چرخ سے بالا ہے آدمی
ہر شے سے کائنات کی اعلےٰ ہے آدمی
محرابِ زندگی کا اُجالا ہے آدمی
لیکن ابھی تو طفلِ دو سالا ہے آدمی

اب تک تو خاک چھاننے والا ہے آدمی

---

(۲)

اِس آدمی کا تجھ سے کہوں کیا میں کیف و کم
اک آن میں ہے سبز، تو اک آن میں بھسم
تِریاق ہے جو صُبح کو، تو شام کو ہے سَم
مُنعِم ہے، تو ہے شیر کا بھی خواہشِ مُحترم

مُفلس ہے تو گدھے کا بھی سالا ہے آدمی

---

(۳)

قُوّت میں بے نظیر، صَولت میں فرد ہے
عزّت میں بے مثال ہے، طاقت میں فرد ہے
اعزاز و احترام و جلالت میں فرد ہے
پیسہ ہے جیب میں تو شرافت میں فرد ہے

پیسہ اگر نہیں تو رذالا ہے آدمی

---

(۴)

کس کو خبر کہ دیوِ تہمتن بنے گا کب
شاہینِ زندگی کا نشیمن بنے گا کب
طاقت کا اِس زمین پہ مامن بنے گا کب
کیا جانیے کہ فاتحِ آہن بنے گا کب

اب تک تو صرف روئی کا گالا ہے آدمی

---

(۵)

اب تک تو آستانِ حماقت ہے اور سر
اب تک تو "خیر" سست ہے، اور تیز گام "شر"
اب تک تو پھر رہا ہے دل و ذہن اِدھر اُدھر
ہر دیو کا میسّا کی خوراک ہے بشر

ہر دیو کامراں کا نوالا ہے آدمی

---

(۶)

انسان وہ کلی ہے جو اب تک کھلی نہیں
وہ شاخ ہے صبا سے جو اب تک ہلی نہیں
پوشاک ہے، یہ وہ جو ابھی تک سلی نہیں
کنجی ہنوز عقل کی اُس کو ملی نہیں

جو آج تک ہے بند، وہ تالا ہے آدمی

---

(۷)

اب تک ہے بزمِ جہل میں ناداں ڈٹا ہوا
اب تک ہے علم و عقل و ہنر میں گھٹا ہوا
اب تک لباسِ ذہن و ذکا سے ہے پھٹا ہوا
اب تک ہے خاکِ تیرہ میں انساں اٹا ہوا

ہر چند خاکِ تیرہ سے بالا ہے آدمی

---

(۸)

پروا کِسے جو آج ہے دِن بھی سیاہ رات
کیا غم اگر زمیں پہ پڑا ہے دُرِ مُسات
یعنی بحکمِ دھر و بفرمانِ کائنات
انساں کو آج روندے ہے ہیں جو حادثات

کل اُن کو جوش روندنے والا ہے آدمی

لاعلاج تاخیر

تُربت کی تیرگی میں اُجالا ہُوا تو کیا
جینے کا بعدِ مرگ سہارا ہُوا تو کیا

سُونا پڑا ہے سینہ، جفائے دماغ سے
اب دل کو اذنِ شرحِ تمنّا مِلا تو کیا

مدّت سے اب تو گیسوئے دانش ہے اور دوش
اب ابرِ زُلفِ یار ہویدا ہُوا تو کیا

یوسف کو رنجِ ہجرِ مُسلسل نے کھا لیا
اب اہتمامِ قُربِ زلیخا ہُوا تو کیا

مجنوں کے ولولوں ہی پہ جب اوس پڑ چکی
صحرا میں رقصِ ناقۂ لیلےٰ ہُوا تو کیا

سُن ہو چکے ہیں حرف و حکایت کے ولولے
اب غُرفۂ حریمِ سخن، وا ہُوا تو کیا

تبدیل ہو چکا تھا جو دریا سراب میں
اب جا کے پھر سراب سے دریا ہُوا تو کیا

پچھلے پہر سے مُہر بہ لب ہے مریضِ غم
اب صُبحِ انبساط کا غوغا ہُوا تو کیا

خود درد بن چُکا ہے مداوائے زندگی
اب دردِ زندگی کا مداوا ہُوا تو کیا

گہوارۂ سفینۂ و بازُوئے ناخُدا
اب ڈُوبنے کے بعد مُہیّا ہُوا تو کیا

اقرارِ دل نوازیٔ و آہنگِ التفات

پھر اُس نگاہِ ناز میں پیدا ہُوا تو کیا
جب ہو چکا شہیدِ خرد جذبۂ جنوں
اب سوئے جیب گل کا اشارا ہُوا تو کیا
اب اک ہلاکِ یاس کا ہنگامۂ نشاط
بے مہر زندگی کو گوارا ہُوا تو کیا
آنکھوں کو جوشِ بند ہوئے دیر ہو گئی
اب بے نقاب عارضِ سلمیٰ ہُوا تو کیا

شش و پنج

(۱)

اے عقل! جنوں زار میں جاؤں کہ نہ جاؤں
پھر دامنِ کہسار میں جاؤں کہ نہ جاؤں
پھر دشتِ فسوں بار میں جاؤں کہ نہ جاؤں
منزل گہِ دشوار میں جاؤں کہ نہ جاؤں

اب کوچۂ دلدار میں جاؤں کہ نہ جاؤں

---

(۲)

افکار کے اِس گُنبدِ سیمیں سے گُذر کر
اِس دائرۂ انجُم و پَروِیں سے گُذر کر
اِس تازہ رَصد گاہِ جہاں بیں سے گُذر کر
تسکین کے اِس گوشۂ تمکیں سے گُذر کر

طُوفان کے دربار میں جاؤں کہ نہ جاؤں

---

(۳)

بیٹھا ہوں سرِ جلوہ گہِ عام تفکّر
رگ رگ میں لیئے بادۂ گلفامِ تفکّر
اِک عُمر سے ہوں مُعتکفِ بامِ تفکّر
مُدّت سے ہوں منجملۂ خُدّامِ تفکّر

اب حُسن کی سرکار میں جاؤں کہ نہ جاؤں

---

(۴)

اِس کارگہِ جُزو و رہِ کُل سے نِکل کر
لمحاتِ تجسّس کے تسلسُل سے نِکل کر
تحقیق کی اِس انجُمنِ گُل سے نِکل کر
حکمت کدۂ فکر و تامّل سے نِکل کر

عشرت کدۂ یار میں جاؤں کہ نہ جاؤں

---

(۵)

اسرار کی ہلچل ہے سرِ کوئے خموشی
تقریر کی شمشیر ہے ابروئے خموشی
طغیانِ فصاحت ہے نم روئے خموشی
مدّت سے ہوں وابستۂ گیسوئے خموشی

اب حلقۂ گفتار میں جاؤں کہ نہ جاؤں

---

(۶)

اِس بارگہِ علم و حقیقت سے گزر کر
اِس ہوش رُبا ذہن کی وُسعت سے گزر کر
اِس ولولہ انگیز قناعت سے گزر کر
اِس مامنِ "اندک" کی فراغت سے گزر کر

پھر محشرِ "بسیار" میں جاؤں کہ نہ جاؤں

---

(۷)

حِکمت نے مجھے لوٹ لیا ، وائے مُقدّر
اِک عالمِ ہُو ہے دلِ مرحُوم کے اندر
سینے ہی میں دوزخ ہے ، نہ آنکھوں میں سمندر
داغوں ہی کے سِکّے ہیں ، نہ اشکوں ہی کے گوہر

اب عشق کے بازار میں جاؤں کہ نہ جاؤں

---

(۸)

ہر سائس ہے یاں حکمت و دانش کی علمدار
ہر گام ہے یاں فکر کی پازیب کی جھنکار
ہر حرف سے اک لشکرِ معنیٰ ہے نمودار
روئے خوشِ کونین ہے اور صحتِ افکار

کوئے دلِ بیمار میں جاؤں کہ نہ جاؤں

---

(۹)

دانش کی محک فکر کی مقیاس کو تج کر
تاجِ سرِ حکمت کے اِس الماس کو تج کر
اِس نکتہ رس و معتدلِ احساس کو تج کر
لحنِ قلم و کاکلِ قرطاس کو تج کر

صحنِ رسن و دار میں جاؤں کہ نہ جاؤں

۱۰۱

یاں شحنۂ سُلطان ہے، نہ اندیشۂ شب خُوں
ہر لفظ کے قطرے میں صحائف کا ہے جیحُوں
ہر آن برستا ہے یہاں بادۂ گُل گُوں
بحرِ نظر و فکر کی ہر موج ہے افسُوں

شہرِ لب و رُخسار میں جاؤں کہ نہ جاؤں

---

(۱۱)

مُنہ پھیر کے اے جوشِ متاعِ سندی سے
بہتی ہوئی اِس حرف و معانی کی ندی سے
اِس حورِ قلم کی کششِ سرو قدی سے
اِس نظم کی فردوسِ حیاتِ ابدی سے

پھر بزمِ گل و خار میں جاؤں کہ نہ جاؤں

ظُلمت کی تمنّا

مُدّتوں کے بعد وہ جانِ بہار
آئی ہے پھر مثلِ ابر کوہسار
پھر صبا کے دوش پر ہے بُوئے مَل
شہر کی رگ میں رواں ہے خونِ گُل
تنگ گلیاں ۔ پیچ و خم کھاتی ہوئی
پھر ہیں مثلِ زلف لہراتی ہوئی
دِل رُبا ہیں پھول، دل کش خار و خس
تازہ ہیں ذرّات، تاباں ہیں کلس

ولولوں کو پھر ہے اذنِ وجد و حال

آئی ہے پھر دل میں فصلِ برشگال

کان میں رہ رہ کے پھر صبح و مسا

آ رہی ہے دل دھڑکنے کی صدا

جاؤں اس تک؟ - یا نہ جاؤں؟ - کیا کروں؟

زہرِ غم کھاؤں؟ - نہ کھاؤں؟ - کیا کروں

زہرِ غم؟ اس سے تو میں ڈرتا نہیں

زہرِ غم تو ہے نباتِ انگبیں

مجھکو تو ہے فکر صرف اس بات کی

میرے چہرے پر نہیں اب روشنی

تلخیٔ غم کھا چکی ساری مٹھاس

رُخ پہ مُحرِ خستگی، آنکھیں اُداس

مُدّتوں سے عارضوں پر ہیں عیاں

کاروانِ ہجر کے گہرے نشاں

بند ہیں چہرے کے سب ٹوٹے ہوئے

خال و خط ہیں ہجر کے لُوٹے ہوئے

سَر میں دَرد آنکھوں میں حلقے، رنگ زرد

عارضوں پر لشکرِ حِرماں کی گرد

آہ اے ایمانِ جوش، اے جانِ جوش

اے متاعِ سنبل و ریحانِ جوش

دامنِ لطف و مسرت تھامنے

آؤں اب کس منہ سے تیرے سامنے

دل ہے سوزِ غم کا جھلسایا ہوا

خال و خط پر ہے دھواں چھایا ہوا

میرے خرمن کو جلا کر آئی ہے

خاک میں مجھکو ملا کر آئی ہے

کاش اٹل اور دائمی ہو جائے رات

اور ایسی، ہات کو سوجھے نہ ہات

کاش، یہ ظالم ستارے ٹوٹ جائیں

رونما بجلی کی نبضیں چھوٹ جائیں

کاش بجھ جائے چراغِ مہر و ماہ
پڑ سکے مجھ پر نہ تا تیری نگاہ
اور تو پھر فیضِ عقلِ ناز سے
مجھکو پہچانے مری آواز سے

اُترا ہوا چہرہ

قطرہ قطرہ کر کے ٹپکے ماہ و سال

اور یوں جسم کر کہ بھیگا بال بال

اور مانندِ بُتانِ بزم گام

سے گذرا کاروانِ صُبح و شام

اور خاموشی سے وقتِ برق پا

مثلِ شبنم رُوح میں کھپتا رہا

اور عزائم کے قفس کی تیلیاں

خون میں کرتی رہیں تبدیلیاں

اور پھر دل کی خوشی کھوتے رہے

تجربوں پر تجربے ہوتے رہے

دشمنوں کی بے محابا دشمنی

دوستوں کا ادّعائے دوستی

بیکسوں کے درد پر آہ و فغاں

اور خلوت گاہ میں خود رحمیاں

اقربا کے جور ہائے بے پناہ

اغنیاء کی زہر میں ڈوبی نگاہ

شام کو بدمست امیروں کی صدا

صبح کو بھوکے فقیروں کی صدا

ہمدموں کی تلخ کامی کا ملال

مُفلسی کا دُکھ، غلامی کا ملال،

شمعِ محفل پر نظر محفل کی فکر

نوعِ انسانی کے مُستقبل کی فکر

شامِ غربت میں بصد رنج و محن

حافظے پر خنجرِ صُبحِ وطن

موسمِ باراں میں، وقتِ ابر و باد

دوستانِ رفتہ کی رہ رہ کے یاد

حال کے آلام، ماضی کے مَلال

دِل میں چھالے، شیشۂ خاطر میں بال

وادیوں کی یاد، کہساروں کی یاد

گل رُخوں کی یاد، مہ پاروں کی یاد،

رُوح میں عشق و جوانی کا مراق

پہلوؤں میں نشترِ ہجر و فراق

روز و شب اِک تازہ درد و خلفشار

جنگ کے اعلان، مرجانے کے تار

ہمدموں کی موت، دِل داروں کی موت

چاند کی گم گشتگی، تاروں کی موت

جلوۂ شبنم، دہکتے بھاڑ میں

سُرخ آنسو، قہقہوں کی آڑ میں

الغرض ہر آن دِل جلتا رہا

کاروانِ زندگی چلتا رہا

دِل ہجومِ غم سے گھبراتا رہا

ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھاتا رہا

آنسوؤں سے ظرفِ جاں بھرتا رہا

کام اپنا دہرِ غم کرتا رہا

دِل، متاعِ سرخوشی کھوتا رہا

عشوۂ شام و سحر ہوتا رہا

اور پھر کچھ دِن کے بعد اے ہمنشیں

دیدہ ہائے صبح تھے جب سُرمگیں

ابرِ غم، ارض و سماء پر چھا گیا
آئینہ دیکھا، تو دِل مُرجھا گیا

دریوزۂ التفات

الف

ہاں اک نظر، خدارا، سوئے سیاہ بختاں

اے تابِ ماہ و انجم، اے شمعِ طاقِ دوراں

تاریک ہے زمانہ، سونا پڑا ہے پہلو

اے صدرِ بزمِ خوباں، اے بدرِ چرخِ ترکاں

ہیں چشم و گوش ویراں کب سے ترے گدا کے

اے خسروِ نکویاں، شاہِ شکر فروشاں

فرقت میں زندگی کی بینائی کھو گئی ہے

للہ اک تجلّی، اے رشکِ ماہِ کنعاں

پہلو میں خارِ غم ہے، سینے میں حبسِ حسرت
فریاد اے گلِ تر، داد اے نسیمِ بستاں

برسوں سے چاندنی کو راتیں ترس رہی ہیں
اے نورِ عقدِ پروین، اے بنتِ ماہِ تاباں

سینے میں پرفشاں ہیں غمہائے تشنہ کامی
یک موجِ دل ربائی، اے کوثرِ خراماں

تیرِ نظر کو سر کر اے ابروئے خمیدہ
اے کعبۂ ہلال و دیرِ کماں فروشاں

سب سے زیادہ شاید شایانِ مرحمت ہے
یہ جوششِ حسن پرور، یہ شاعرِ شبستاں

دریوزۂ التفات

(ب)

رُکنے لگی ہے نبضِ رفتارِ جاں نثاراں

تا کَے یہ تُند گامی اے میرِ شہسواراں؟

خوبانِ شہر کیا کیا اِترا کے چل رہے ہیں

آ، بوستاں میں در آ، اے فاتحِ نگاراں

ہاں کھول دے یہ زلفیں غلطاں ہے جنمیں کب سے

تعبیرِ خوابِ سنبُل تفسیرِ موجِ باراں

آنکھیں ہیں زخم خوردہ، دِل ہے خزاں گزیدہ

تکلیفِ یک تبسّم، اے دولتِ بہاراں

ہاں جوشؔ پر کرم کر، کب سے تڑپ رہا ہے

یہ ماہِ چرخِ رنداں، یہ شاہِ بادہ خواراں

بشارت

بمبئی میں، یہ سُنا ہے کہ ریاکاروں نے
کر دیا خلق پہ دروازۂ خمّارات کا بند[1]
اِن فراعت کے حریفوں کی ہے شاید یہ غرض
کہ نہو چند نفس بھی کوئی غمگیں خورسند
مرکبِ ہوش رہے آٹھ پہر ذہنِ بشر
اِس سے بڑھ کر نہیں واللہ کوئی اور گزند
خشک ہو جائے جو دُنیا تو جہنم بن جائے
آبِ کوثر کی قسم، آتشِ تر کی سوگند

[1] یہ نظم بمبئی میں امتناعِ شراب کے موقع پر کہی گئی تھی۔

ترک سے، کہتے ہیں بن جائے گی دُنیا زردار

زر سے کیا فائدہ جب زر کا فسوں چشمہ ہو بند؟

زر کا ہے سجدۂ شکرانہ خریداری مے

حیف، اس راز سے واقف نہیں زر کے فرزند

کم سے کم اُن کو تو صہبا سے نہ روکا ہوتا

جن کے اِحساس ہیں باریک، خیالات بلند

اے عدوئے تری و بندۂ خشکی و سراب

غرق ہو بادۂ رنگیں میں ترا دانۂ بید

عیبِ مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

لفیٔ حکمت مکن از بہرِ دلِ عامے چند" (حافظ)

لیکن اے رندِ خرابات، نہ ہونا مایوس

کسی قانون کا مے خانہ نہیں ہے پابند

کچھ اگر شک ہو تجھے، پوچھ لے امریکہ سے

قطع ہونے سے بھبکتا ہے یہ پودا دہ چند

ذوقِ حوّا کی قسم، فطرتِ آدم کی قسم

شاخِ صہبا پہ کوئی ڈال سکے گا نہ کمند

فرض کرلے کہ خرابات کے دروازے کو

اگر از بہرِ دلِ زاہد بدیں بستند

دل قوی دار کہ از بہرِ خدا بگشایند" (حافظ)

فطرتِ اقوام

ظُلمِ لاانتہا سے تنگ آکر
آدمی چاہتا ہے آزادی
ہو کے آزاد۔ پھُونک دیتا ہے
دُوسرے بھائیوں کی آبادی
پہلے بنتا ہے دُشمنِ جلّاد
خود ہی پھر سیکھتا ہے جلّادی
خود کو آباد کر کے، یہ جوان،
ڈال دیتا ہے طرحِ بربادی

پا کے اپنے حقوق - اوروں کے

چھینتا ہے حقوقِ بنیادی

پہلے تو ظالموں سے ڈرتا ہے

اور پھر خود ہی ظلم کرتا ہے

وعدہ فراموشی

سمجھتا تھا میں تیرے عہدِ وفا میں
پہاڑوں کے مانند ہے استواری
مجھے تجکو پا کر یقیں ہو چلا تھا
کہ اب ختم ہے دورِ فریاد و زاری
میں یہ راہِ غم میں سمجھنے لگا تھا
کہ اب بخت کی موڑ پر ہے سواری
مٹے گی، مجھے یہ گماں ہو چلا تھا
مری تیرہ بختی، مری سوگواری

میں خوش تھا کہ اب چھوٹ جائیگی مجھ سے

یہ ذرّات بازی، یہ اختر شماری

غرض یہ اُمیدیں، غرض یہ اُمنگیں

کہ مبنی تھی جن پر مری، کامگاری

چلی اُن پہ، صد حیف، تلوار بنکر

تری کم سِنی کی فراموش کاری

مداوا کر اے چارہ سازِ مریضاں

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری

"تجھے کس تمنّا سے ہم دیکھتے ہیں" (غالب)

سُونی جنّت

ہاں یہی ہے وہ مکاں، وہ جنّتِ دورِ کُہن
کل تھا جس کی انجمن میں حُسن صدرِ انجمن
ہاں یہ پُل ہے ریل کا، اور یہ چمکتی پٹریاں
داستاں در داستاں و داستاں در داستاں
ہاں یہ کھڑکی ہے وُہی، اور یہ سلاخیں ہیں وُہی
جھانکتی تھی جن سے اُس کھڑکی کی میٹھی چاندنی
ہاں یہیں، جب پڑ رہی تھی ایک دن ہلکی پھوار
گر رہا تھا سُرخ زُلفوں کا سُنہرا آبشار

چھو رہی ہے دل کو نوکِ خارِ سم بخت سانس

یہ مکاں ہے، یا کوئی چبھتی ہوئی سینے کی پھانس

آہ یہ دَر، جس پہ شمعِ زندگی کا نور تھا!

حیف یہ گھر، جو کلیمِ عصرِ نو کا طور تھا

آج عبرتناک ہے، بے رُوح ہے، بیہوش ہے

کل حیات و نغمہ تھا۔ اب سَرد ہے خاموش ہے

(۲)

گھر کو اندر سے بھی دیکھوں یا سڑک ہی پر رہوں؟

خیر، اندر بھی چلوں، فرمانِ دِل ہے۔ کیا کروں

اُف یہ سُرخی کا نشاں۔ پہچانتا ہوں میں اِسے

جانتا ہے یہ مجھے۔ اور جانتا ہوں میں اِسے

. . . . . .

. . . . . .

ہاں، یہاں آرام کرتی تھی وہ تھک جانے کے بعد

ہاں، یہاں وہ بیٹھتی تھی غُسل فرمانے کے بعد

ہاں، یہاں بدلے تھے بیچینی سے زالوں ایک دِن

ہاں یہاں ٹپکے تھے اُن آنکھوں سے آنسو ایکدن

مُسکرا کر اک ادائے نو سے دیکھا تھا یہاں

کاٹ کر دانتوں سے اک دن پان بخشا تھا یہاں

دامنِ جاں سوزنِ سیّال سے سیتا تھا میں

ہاں اِسی گوشے میں اکثر رات کو پیتا تھا میں

وہ کسی کا درسِ ترکِ مے گساری، ہائے ہائے

وہ مرا ہنس ہنس کے شغلِ بادہ خواری، ہائے ہائے

بال چھیڑا تھا فسونِ نہانی ایک دن

اِدھر بیٹھے تھے جب برسا تھا پانی ایکدن

آج بھی محفوظ ہیں سونے در و دیوار میں

وہ ترانے کل جو غلطاں تھے لبِ گلبار میں

اب بھی جلووں کی شعاعیں پیش و پس تابندہ ہیں

اب بھی اِن غرفوں میں لاکھوں بجلیاں پیوندہ ہیں

ذرّے ذرّے میں کھٹک محسوس ہوتی ہے یہاں

دل دھڑکنے کی دھمک محسوس ہوتی ہے یہاں

خوں کے ذرّات اب بھی رقص کرتے ہیں یہاں

کانپتی ہیں دھندلی دھندلی چمپئی پرچھائیاں

ان ہواؤں میں جوانی کی مہک ہے آج بھی

ساحرانہ لوچ، نرکانہ لچک ہے آج بھی

جن کے ہر اک نقش میں تھا جاوۂ گلہائے تر

جھجھ رہے ہیں آج کانٹے بن کے وہ دیوار و در

خوں میں ڈوبا ہوا انسان کا افسانہ ہے

کل جو گھر عشرت سرا تھا، آج ماتم خانہ ہے

(۳)

کون؟ یہ کیسی صدا؟ کس کی صدا؟ یہ کیا کہا؟

"جوش، تنہا جوش، میں تیری اُداسی پر فدا"

اُف۔ مرا دل شق ہُوا جاتا ہے۔ یہ کیا راز ہے؟

یہ مرے دل کی صدا ہے۔ یا تری آواز ہے؟

چھوٹ جا اے مُرغِ جاں، دامِ نفس سے چھوٹ جا

ٹُوٹ جا اے رشتۂ عُمرِ دو روزہ، ٹُوٹ جا

. . . . . .

. . . . . .

اُڑ کے خود آ، یا مجھی کو رخصتِ پرواز دے

کس لئے چُپ ہو گئی؟ آواز دے، آواز دے!!

(۱۹۴۴ء)

تعاقب

"مُرد ہو، عشق سے جہاد کرو"

"اَب مجھے بھُول کر نہ یاد کرو"

"دِل سے بِیتے دِنوں کی یاد مِٹاؤ"

"نہ تو اب خود ہی رو، نہ مجبور رُلاؤ"

"بُھول جاؤ کہی سُنی باتیں"

"نہ تو وہ دِن ہیں اب، نہ وہ راتیں"

"اب نہ وہ موڑ ہیں، نہ وہ گلیاں"

"اب نہ وہ پھُول ہیں، نہ وہ کلیاں"

"اِس جہاں سے گذر چکی ہُوں میں"

اب یہ سمجھو کہ مر چکی ہُوں میں"

"ایک دُکھیا کو اَور اب نہ ستاؤ"

بَن پڑے تو مری گلی میں نہ آؤ"

مَرد ہو۔ عِشق سے جہاد کرو"

"اب مُجھے بھُول کر نہ یاد کرو"

(۲)

میرے کانوں میں، میرے سینے میں

گُونجتی رہتی ہیں یہ، آوازیں"

حس طرف جاؤں، دِل بُلاتی ہیں

یہ مرے ساتھ ساتھ جاتی ہیں

بادِ جاں بخش سے، بگولوں سے

سخت کانٹوں سے، نرم پھُولوں سے

یہ صدائیں برابر آتی ہیں

دِل کا دروازہ کھٹ کھٹاتی ہیں

"بھُول جاؤ کہی سُنی باتیں"

"نہ تو وہ دِن ہیں اب، نہ وہ راتیں"

"مرد ہو۔ عشق سے جہاد کرو"

"اب مجھے بھُول کر نہ یاد کرو"

تنگ آ کر جدھر بھی جاتا ہوں

اِن صداؤں کو ساتھ پاتا ہوں

صحنِ گیتی سے، اَدرجِ گردوں سے

تابِ اَجسام سے آبِ جیحوں سے

بحرِ متلاطم کے حبابوں سے

حکمت و شعر کی کتابوں سے

شورشوں، غلغلوں، دھماکوں سے

تیز رَو گاڑیوں کے پہیوں سے

شعر گوئی سے، شعر خوانی سے

ہر حقیقت سے، ہر کہانی سے

چوڑی سڑکوں سے، تنگ گلیوں سے

ہلتی شاخوں سے، کھلتی کلیوں سے

شورِ جلوت، سکوتِ خلوت سے

جنبشِ ضو، جمودِ ظلمت سے

معبدوں سے، شراب خانوں سے

مطربِ خوش نوا کی تانوں سے

بوئے عنبر سے، بادِ صرصر سے

روئے خوباں سے، رنگِ مرمر سے

قصرِ منعم سے، قبرِ مفلس سے

پائے طاؤس و چشمِ نرگس سے

جانِ گوہر سے، رُوحِ نسریں سے

مَوجِ سُنبُل سے، اَوجِ پَروِیں سے

باغ سے، مَدرِسے سے، جنگل سے

تپتے سُورج، بَرستے بادل سے

یہ صدائیں برابر آتی ہیں !!!

دِل کا دروازہ کھٹ کھٹاتی ہیں

"بھول جاؤ کہی سُنی باتیں"

"نہ تو وہ دِن ہیں اَب، نہ وہ راتیں"

"ایک دُکھیا کو اور اب نہ ستاؤ"

"بَن پڑے تو مری گلی میں نہ آؤ"

"اب جہاں سے گذر چکی ہوں میں"

"تم یہ سمجھو کہ مر چکی ہوں میں"

"مرد ہو، عشق سے جہاد کرو"

"اب مجھے بھول کر نہ یاد کرو"

تقلید و تحقیق

(۱۹۴۴ء)

افسونِ ذات ، اور افسانۂ صفات

بالا ہے اِس سے مردِ قلندر کی کائنات

حقّی کہ صاحبانِ روایت کے دین سے

پاکیزہ تر ہیں اہلِ درایت کے کفریات

کیوں کر یقیں دلائیے اربابِ "عشق" کو
مبنی ہے صرف عقل پر انسان کی نجات

"آیاتِ بیّنات" ہیں "ظلمت" کی چھاؤں میں

"ظلمت" کے زیرِ سایہ ہیں "آیاتِ بیّنات"

ایوانِ فکر کے خس و خاشاک کے حضور

بے آبرو ہیں دیر و حرم کے متبرکات

ہو جائے گا زمین پہ در آسماں کا بند

کھل جائیں گے عقول پہ جب رازِ کائنات

زہ کر چکے ہیں اہلِ بصیرت کمانِ عقل

ہشیار آشیانے سے مرغِ الٰہیات

صدہا مقلدوں کے گراں محکمات پر

بھاری ہیں جوش ایک محقق کے ظنیات

ہاں یاد کر سحر! (۱۹۴۴ء)

ہاں یاد کر سحر، وہ صبا کی عنائتیں
مہکی وہ کاکلیں، وہ بہکتی ردائتیں
شیریں لبوں میں حرف و حکایت کے ولولے
نیچی نظر میں عشق و جوانی کی غائتیں
زلفوں کی وہ نسیم سے برہم کہانیاں
پلکوں کی وہ خمار سے بوجھل حکائتیں
آنکھوں پہ گیسوؤں سے برستے وہ بوستاں
کانوں پہ لعلِ لب سے اترتی وہ آئتیں

ناشتہ رُخ کے سُرخ دھندلکے میں جوش سے

پچھلے پہر وہ لشکر سے بہت شکائتیں

اے مَن، کاہے تُو گھبرائے؟ (۱۹۴۳ء)

(۱)

وہ پھُوٹ رہی ہے پَو پیارے
وہ کانپ رہی ہے لَو پیارے
دیکھ وہ جَل تھَل سب مُسکائے
اے مَن، کاہے تُو گھبرائے؟

(۲)

انگڑائی لے کر، بکھرا کر
وہ بھور پری سے مُسکا کر،
اپنے جُھمکے، لے، جَھمکائے
اے مَن، کاہے، تُو گھبرائے؟

(۳)

پھیلی سُنہری دھوپ ندی پر

مچلا رنگ اور رُوپ ندی پر

بھاگے، رَین کے بھاگے سائے

اے مَن، کاہے تُو گھبرائے؟

(۴)

گھبرا کر بَن میں بولا مور!

تَن دہکا، من سے اُٹھا شور

جوں ساون ندیا لہرائے

اے مَن، کاہے تُو گھبرائے؟

(۶)

دیکھ تو سر پر تاشے بجتے

گاتے گھرتے گھوم گرجتے

کارے کارے بادر چھائے

اے من کاہے تو گھبرائے؟

(۷)

آئی وہ گاتی بادِ بہاری

ہلتی ہیں بیلیں ڈاری ڈاری

جس[1] پاپی جوڑا کھل کھل جائے

اے من کاہے تو گھبرائے؟

[1] جس مرحج

(۸)

کشٹ بچن مت بول ری پیاری

گھونگھٹ کے پٹ کھول ری پیاری

آئے وہ تیرے ساجن آئے

اے مَن کاہے تُو گھبرائے؟

کاہے تُو گھبرائے؟

اے مَن، کاہے تُو گھبرائے؟

جنوں تیرتا پھر رہا ہے فضا میں

(۱)

قیامت کی رنگینیاں ہیں خلا میں
نئے ارغنوں بج رہے ہیں ہوا میں
فسانوں کا افسوں ہے ارض و سما میں،
ترنّم ہے سارنگیوں کا صبا میں

گلابی کو جھمکا، گلابی گھٹا میں

جنوں تیرتا پھر رہا ہے فضا میں

---

(۲)

جواں ہیں ہوائیں، جوانی کی لے سے
مُعطّر ہے ارض و سما بُوئے مے سے
گھٹاؤں میں ہیں پیچ و خم کیسے کیسے
فضاؤں میں ہلچل کچھ ایسی ہے، جیسے

تڑپتا ہے دِل، عشق کی ابتدا میں

جنوں تیرتا پھر رہا ہے فضا میں

---

(۳)

نہ غم کی حکومت ، نہ ماتم کا سایہ
طرب سے دمکتا ہے گیتی کا مکھڑا
تکلم ، تبسم ، ترنم ہے دنیا
خوشی سے ہے غم اس طرح دنگ گویا

خدا - حلقۂ منکرانِ خدا میں

جنوں تیرتا پھر رہا ہے فضا میں

(۴)

عَلَم شادمانی کا لہرا رہا ہے

غزل خوان و رقصاں و خنداں ہوا ہے

بہکتی، چہکتی، مہکتی فضا ہے

پہاڑوں کے دامن میں کالی گھٹا ہے

کہ قدرت ہے بوتل دبائے عبا میں

جنوں تیرتا پھر رہا ہے فضا میں

(۵)

گر جبتی گھٹاؤں کے سانچے میں ڈھل کر
تلاطم سے تمکین کا سر کچل کر
ریاخانۂ زندگی سے نکل کر
گذاریں خرابات میں آؤ چل کر

یہ رنگین صبحیں ، یہ رنگین شامیں

جنوں تیرتا پھر رہا ہے فضا میں

(۶)

چلو دستِ ہستی میں پھر ارغنوں دیں

تب و تابِ افسانہ، رنگِ فسوں دیں

نقیبِ خرد کو نویدِ جنوں دیں

ہواؤں میں رقصاں ہیں یوں رس کی بوندیں

دھڑکتا ہے دل، جوش، جیسے دعا میں

جنوں تیرتا پھر رہا ہے فضا میں

زندگی کے دو رُخ

(۱)

دِل کی ہوتی تھی گاہ مہمانی

گاہ دِل صرفِ میزبانی تھا

وقت کی گل فروش شاخوں پر

مرغِ جاں محوِ نغمہ خوانی تھا

وہ بھی اِک خوابِ زندگانی تھا

(۲)

سرِ گیتی، نظامِ لالہ و گل

زیرِ منشائے نوجوانی تھا

سرِ گردوں، خرامِ لیل و نہار

حسبِ ایمائے شادمانی تھا

وہ بھی اِک خوابِ زندگانی تھا

---

(۳)

مہر، ملّاح کا تھا اِک قصّہ

ماہ، کشتی کی اِک کہانی تھا

قہقہوں کی کمان تھی گلرنگ

چہچہوں کا لباس دھانی تھا

وہ بھی اک خوابِ زندگانی تھا

---

(۴)

اور اب تلخیوں کی یورش سے

سینہ کوبی ہے، سرگرانی ہے

کل تھی پانی میں روحِ آبِ حیات

آج آبِ حیات پانی ہے

یہ بھی اِک خوابِ زندگانی ہے

---

(۵)

کل تھا دِل، پائے تختِ تابانی
آج ظُلمت کی ساج دھانی ہے

کل تھا دَورِ حیات چھٹتی دُھوپ
آج کھُلتی ہوئی کمانی ہے

یہ بھی اک خوابِ زندگانی ہے

---

(۶)

کل تھی چہرے پہ زرفشاں سُرخی
رنگِ رُخ آج اَرغوانی ہے
کل میسّر تھی خاتمِ عشرت
آج اک داغِ دل نشانی ہے

یہ بھی اک خوابِ زندگانی ہے

اے رحمتِ یزداں

ہر صُبحِ وطن میں ہے نہاں شامِ غریباں
ہر خندۂ پیدا میں ہے اک گریۂ پنہاں
ہر کاوشِ درماں میں ہے اِک دردکا عُنواں
ہر نیند میں ہے فتنۂ صد خواب پریشاں
——— اے رحمتِ یزداں!
کیا رحمتِ عام ہے اے رحمتِ یزداں!
اے رحمتِ یزداں!
اے رحمتِ یزداں!

(۲)

یہ اِس کا خریدار ہے، وہ اُس پہ فدا ہے

یہ اُس سے بہت دُور ہے، وہ اُس سے جُدا ہے

ہو قُرب بھی حاصل تو تعاقُب میں قضا ہے

ہر وصل میں ہلچل ہے، تو ہر ہجر میں طوفاں

——— اے رحمتِ یزداں!

کیا رحمتِ عام ہے اے رحمتِ یزداں!

اے رحمتِ یزداں!

اے رحمتِ یزداں!

(۳)

ارمان کے جادے میں نہیں ہے کوئی منزل

بے آب ہے، بے رنگ ہے، ہر دولتِ حاصل

بے قدر ہے، املاک میں جو شے بھی ہے شامل

اللہ ری لب تشنگیٔ فطرتِ انساں

——— اے رحمتِ یزداں!

کیا مرحمتِ عام ہے اے رحمتِ یزداں!

اے رحمتِ یزداں!

اے رحمتِ یزداں!

(۴)

ہر سعی کے آغاز میں ہے درد و مصیبت

ہر کام کے انجام میں ہے خفّت و حسرت

ہر شب کو ہے پیغمبریٔ نالۂ کلفت

ہر صبح کو ہے داوریٔ دیدۂ گریاں!

——— اے رحمتِ یزداں!

کیا رحمتِ عام ہے اے رحمتِ یزداں!

اے رحمتِ یزداں!

اے رحمتِ یزداں!

یہ امیروں کے مُصاحب

یہ اَمیروں کے مُصاحب، یہ سلاطین کے ندیم
جن کے دِل رہتے ہیں آقاؤں کی ہیبت سے دونیم
دِل تو دِل، شام و سحر، جن کے دھڑکتے ہیں دماغ
اپنی عزّت کے لہُو سے جو جلاتے ہیں چراغ
جن کے دِل، اندیشۂ فردا سے رہتے ہیں فگار
جن کی راتیں، خوابِ شیریں سے نہیں ہوتیں دوچار
تیغ بن کر جن کے دِل کو حسبِ آئینِ کہن
کاٹتی رہتی ہے آقاؤں کے ماتھے کی شکن

آئے دن آتی ہیں جن کی بستیوں میں آندھیاں

شاخِ نخلِ برق پر رہتا ہے جن کا آشیاں

کانپ اٹھتے ہیں، جو سنتے ہیں کوئی ہے؟ کا دہل

بولتے ہیں زیرِ لب، چلتے ہیں جو پنجوں کے بل

جن پہ واجب، خاص خدمت گار کا بھی احترام

جو محل کی مہترانی تک کو کرتے ہیں سلام

تمکنت رہتی ہے جن کی، زلزلوں کے دوش پر

جن کے سر کا مستقر سرکار کی پاپوش پر

رہتی ہیں نظریں جو کل کی بھوک کے امکان پر

سوچتے رہتے ہیں آقاؤں کے دسترخوان پر

زہر سینوں میں رہا کرتا ہے، ہونٹوں پر بنات

کھل کے آپس میں بھی کر سکتے نہیں جو دل کی بات

بزم، رقص و رنگ میں بھی جن کو رکھتا ہے نڈھال

دو گھڑی میں نوکری کے چھوٹ سکنے کا خیال

پا نہیں سکتا کوئی جن کی دناءت سے نجات

تہمت و غیبت ہے جن کے دین میں صوم و صلوٰۃ

جن کی ہٹتی ہی نہیں عیب حریفاں سے نگاہ

جن میں سے ہر فرد ہے اک دوسرے کا مرگ خواہ

جو ہیں گویا چھلنیاں تالاب میں ڈوبی ہوئی

تہ سے ابھریں تو رہے باقی نہ جن میں بوند بھی

چین سے پل بھر بھی جن کو بیٹھنے دیتا نہیں

اپنی وحشت آفریں ناقابلیت کا یقیں

عالموں کا فضل، جن کے حق میں ہے خوفِ گزند"

عاقلوں کی باریابی جو نہیں کرتے پسند

جن کے ہونٹوں پر دعا رہتی ہے "یا فتاحِ باب

کوئی دانا قصر میں ہونے نہ پائے باریاب"

لوچ کھاتی جن کی کمریں، اور پھڑکتی بوٹیاں

مسخرے پن کی ملا کرتی ہیں جن کو روٹیاں

گھورتے رہتے ہیں یوں آقا کو جو شام و پگاہ

جس طرح قصاب پر رہتی ہے کتوں کی نگاہ

گاؤں کی کوڑھی تنبولن کے سڑے پیڑے ہیں یہ

شہریوں کی شکل میں طاعون کے کیڑے ہیں یہ

آزردگیٔ بے سبب

بہ یادگارِ دعوتِ ڈپٹیاں[1] بخانۂ صوفی وخواہرش شعرے کہ ہنگامِ اکلِ ڈپٹیاں معروف شربت بود

حضرۃ جوشش، آپ یہ اِس وقت

شاہ صاحب[2] سے کیوں ہیں آزردہ؟

میرے نزدیک تو جناب کا دِل

اِک غلط بات پر ہے پژمردہ

یہ جنِ بے دِلی، یہ دیوِ غضب

حرف حضرۃ ہی کا ہے آزردہ

حیف مابینِ میکش و مے نوش

چھڑ گئی بحثِ زندہ و مردہ

[1] ڈپٹی کلکٹر [2] آگرے کے ایک صوفی دوست

شاعروں کو نہ حاکموں سے گھٹائیں

صوفیوں کا نہیں یہ دل گردہ

کس لئے یہ بچا کھچا کھانا

آپ کو کر رہا ہے افسردہ ؟

جب مئے ناب پی ہے تو بخوشی

کھایئے ڈپٹیوں کا پس خوردہ!

(سنہ ۱۹۴۴ء)

سفّاکِ رحم

فرق پر ہے لوائے جذبۂ رحم
عشق ہے اب غذائے جذبۂ رحم

کاش اُس دل میں اب بھی اگلا سا
اُنس ہوتا بجائے جذبۂ رحم

اُس نظر میں بجائے سوزِ نہاں
اب ہے غلطیدہ ہائے جذبۂ رحم

کل تھی وہ مُلتفت بحُکمِ خلوص
آج ہے بر بنائے جذبۂ رحم

عہدِ پیشیں کی سمت اُس دِل کو
موڑ دے اے خُدائے جذبۂ رحم

(۱۹۴۴ء)

اے دِل

مہر ہے کچھ، نہ ماہ ہے اے دِل
سب فریبِ نگاہ ہے اے دل

نہ ترنّم ہے مُستقل نہ سرود
مُستقل ہے تو آہ ہے اے دِل

ہر گُہر، اشکِ غم ہے دُنیا میں
ہر کلی، برگِ کاہ ہے اے دل

ہر گُلستاں پہ ہے نگاہِ خزاں
ہر یقیں، اِشتباہ ہے اے دِل

زندہ رہنا ہے اک خطائے عظیم
سانس لینا گناہ ہے اے دِل

زندگیٔ مسیح و عُمرِ خضرؑ
زحمتِ یک نگاہ ہے اے دِل

اب کھُلا یہ کہ محفلِ درماں
دردکی بارگاہ ہے اے دِل

تیرگی ہی پہ کچھ نہیں مَوقُوف
روشنی بھی سیاہ ہے اے دِل

(سنہ ۱۹۴۴ء)

آخری تمنّا

اب تمنّا نہیں سینے سے لگانے کی تجھے

اپنے دُکھتے ہوئے پہلو میں بٹھانے کی تجھے

اب نہ وہ شوق ہے مہکے ہوئے بُستانوں کا

اب نہ وہ رقص ہے دہکے ہوئے ارمانوں کا

اب نہ وہ چاندنی راتوں کا ہے غوغا دل میں

اب نہ وہ قوسِ قُزح کی ہے تمنّا دل میں

اب تھکے دل میں وہ ہلچل نہیں ارمانوں کی

سانس رکتی تھی جسے دیکھ کے طوفانوں کی

اب نہ وہ دِن، نہ وہ سِن کہ بہ آہنگِ رباب

ساحلِ بحر پہ رقصاں و غزلخواں ہو شباب

دِل کہ تھا راہِ دف و چنگ دکھانے والا

وہ ہر اک گام پہ سو جشن منانے والا

جس کے دم سے تھی چمک رُوح کے آئینے میں

دفن ہے اب وہ بہت دِن سے مرے سینے میں

اب تو جب پچھلے پہر بادِ صبا آتی ہے

کان میں موت کے قدموں کی صدا آتی ہے

اب تو صرف اِتنی تمنا ہے کہ اے بنتِ بہار

دیکھ لوں ہوش میں جی بھر کے تجھے پھر اک بار

اب نہیں شوق کہ پہلو میں بٹھاؤں تجھکو

بھینچ کر خوب کلیجے سے لگاؤں تجھکو

پرتوِ بادہ سے ہر پھول کو انگارہ کروں

ہار گردن میں تری ڈال کے نظارہ کروں

یوں تو آغوشِ تمنا کا سدا خالی ہے

نوعِ انساں کی یہ آبائی زبوں حالی ہے

مرتے مرتے بھی نکلتے نہیں دل کے ارماں

اسی بحران میں مرجاتا ہے آخر انساں

پھر بھی۔ ہر چند کہ ہر آن تھی صدر بجوری

میری لاکھوں ہی تمنائیں ہوئی ہیں پوری

کتنے جلوے ہیں مرے قلب کے آئینے میں

کس قدر چاندنی راتیں ہیں مرے سینے میں

تھیں کبھی تیرے تبسّم سے جو مست و مطموع

اب بھی ہوتی ہیں وہ صبحیں مرے سینے میں طلوع

شکوہ ہر چند نہیں دہر کا جو بھر دل میں

پھر بھی اک پھانس کھٹکتی ہے برابر دل میں

اور وہ پھانس ہے اک حسرتِ آخر اے جاں

دین کا جس میں خسارہ ہے، نہ دنیا کا زیاں

یعنی ماضی کی طرف ایک اشارہ کر لوں

آ کہ جی بھر کے پھر اک بار نظارا کر لوں

تُو اگر صورتِ زیبا نہیں دکھلائے گی

یہ غلط ہے کہ مجھے موت نہیں آئے گی

ہاں مگر سانس مرے حلق میں اٹکے گی ضرور

پھانس ارماں کی بُری چیز ہے کھٹکے گی ضرور

بس یہ حسرت ہے، کہ یہ پھانس نہ کھٹکے اے جاں

آخری وقت مری رُوح نہ بھٹکے اے جاں

تازہ بیتے ہوئے لمحوں کو دوبارہ کر لوں

آ کہ پھر دھوم سے اک بار نظارہ کر لوں

(۱۹۳۶ء)

ہولناک تبدیلی

ایک زینہ ہے۔ اِدھر میرا مکاں ہے، اور اُدھر

کچھ دنوں سے آ کے ٹھہرا ہے کوئی شخصِ دگر

رات کو زینے سے آئی نرم سیٹی کی صدا

سُن کے اُس سیٹی کو میری زندگی نے یُوں کہا

تجھ سے مِلنے کو کبھی یہ شخص آ سکتا نہیں

اب یہاں ذوقِ جوانی بار پا سکتا نہیں

اب تو آئیں گے یہاں لے دے کے اربابِ کلیمؔ

زرد چہروں پر صحافت کا لئے بارِ عظیم

کلیمؔ کے ہونے والے کا نام۔ جو ۱۹۳۵ء میں دہلی سے عجلت اور ۱۹۳۹ء میں ملیح آباد جا کر بند کر دیا گیا تھا۔

مطبع و منبر کی لاکھوں جھڑکیاں کھائے ہوئے

کاتبوں کے وعدۂ فردا سے گھبرائے ہوئے

جادۂ آسودگی وامن سے بھٹکے ہوئے

زاہدوں کے دامنوں کی طرح منھ لٹکے ہوئے

آئے گی جن کے شکن آلود ماتھوں سے صدا

"کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا"

خانۂ ویراں میں آبادی کی وہ شانیں کہاں

میرے گرد و پیش اب سیٹی کہاں، تانیں کہاں

جوشِ سا انسان، فکروں سے کچل کر رہ گیا

ہائے کیا مے خانہ، دفتر میں بدل کر رہ گیا

اے وائے آدمی (۱۹۴۲ء)

(۱)

خوشیاں منانے پر بھی ہے مجبور آدمی
آنسو بہانے پر بھی ہے مجبور آدمی
اور مسکرانے پر بھی ہے مجبور آدمی
دُنیا میں آنے پر بھی ہے مجبور آدمی

دُنیا سے جانے پر بھی ہے مجبور آدمی
اے وائے آدمی
مجبور و دل شکستہ و رنجور آدمی
اے وائے آدمی

(۲)

کیا بات آدمی کی کہوں تجھ سے ہم نشیں
اِس ناتواں کے قبضۂ قدرت میں کچھ نہیں
رہتا ہے گاہ حجرۂ اعزاز میں مکیں
پر زندگی الٹتی ہے جس وقت آستیں

غربت گنوانے پر بھی ہے مجبور آدمی
اے وائے آدمی
مجبور و دلِ شکستہ و رنجور آدمی
اے وائے آدمی

(۳)

اِنسان کو ہَوس ہے بِجیئے صُورتِ خِضر

ایسا کوئی جتن ہو کہ بَن جایئے اَمر

تا روزِ حشر، مَوت نہ پھٹکے اِدھر اُدھر

پر زِیست جب بدلتی ہے کروٹ کراہ کر

تو سر کٹانے پر بھی ہے مجبُور آدمی

اے وائے آدمی

مجبُور و دِل شکستہ و رنجُور آدمی

اے وائے آدمی

(۴)

اِنسان، بحرِ صِدق ہے، سرچشمۂ صفا

اِنسان، حق پرست ہے، حق بیں، حق آشنا

اِنسان، راست باز ہے، اِنساں ہے بے ریا

پر اُس کو آنے لگتا ہے جب جھوٹ میں مزا

زیبؔ اُڑانے پر بھی ہے مجبور آدمی

اے وائے آدمی

مجبور، دل شکستہ و رنجور آدمی

اے وائے آدمی

(۵)

انساں، معاملت میں بھی ہے معدلت پناہ

ہر عذرِ لنگ اُس کی شریعت میں ہے گناہ

رکھتا ہے خوش معاملگی ہی سے رسم و راہ

لیکن جب آ کے آنکھ دکھاتا ہے قرضخواہ

حیلے بہانے پر بھی ہے مجبور آدمی

اے وائے آدمی

مجبور و دل شکستہ و رنجور آدمی

اے وائے آدمی

۶

اِنساں ہے جُود و بَذل و قناعت کی کائنات
لالچ کو اَور ہَوس کو سمجھتا ہے دُونِ ذات
اور مارتا ہے دولتِ قارُون پر بھی لات
لیکن لگا رہا ہے مُقدّر جب اُس کی بات

جُوتے چُرانے پر بھی ہے مجبُور آدمی
اے وائے آدمی
مجبُور و دِل شکستہ و رنجُور آدمی
اے وائے آدمی

(۷)

دل کو بہت ہے ہنسنے ہنسانے کی آرزو

ہر صبح و شام جشن منانے کی آرزو

گانے کی اور ڈھول بجانے کی آرزو

پینے کی آرزو ہے، پلانے کی آرزو

اور زہر کھانے پر بھی ہے مجبور آدمی

اے وائے آدمی

مجبور و دلِ شکستہ و رنجور آدمی

اے وائے آدمی

(۸)

ہر دل میں ہے نشاط و مسرت کی تشنگی
دیکھو جسے وہ چیخ رہا ہے "خوشی خوشی"
اس کارگاہِ فتنہ میں لیکن کبھی کبھی
فرزندِ نوجوان و عروسِ جمیل کی

میّت اُٹھانے پر بھی ہے مجبور آدمی
اے وائے آدمی
مجبور و دلِ شکستہ و رنجور آدمی
اے وائے آدمی

(۹)

ہر دل کا حکم ہے کہ رفاقت کا دم بھرو

احباب کو ہنساؤ میاں، آپ بھی ہنسو

چھوٹے نہ دوستی کا تعلق، جو ہو سو ہو

لیکن ذرا سی دیر میں یارانِ خاص کو

ٹھوکر لگانے پر بھی ہے مجبور آدمی

اے وائے آدمی

مجبور و دل شکستہ و رنجور آدمی

اے وائے آدمی

(۱۰)

مکھی بھی بیٹھ جائے کبھی ناک پر اگر

غیرت سے ہلنے لگتا ہے مردانگی کا سر

عزت پہ حرف آئے تو دیتا ہے بڑھ کے سر

اور گاہ روز غیر کے بستر پہ رات بھر

جو روسلا نے پر بھی ہے مجبور آدمی

اے وائے آدمی

مجبور و دل شکستہ و رنجور آدمی

اے وائے آدمی

(۱۱)

رہتا ہے عطر و عود میں کیا کیا بسا ہوا
پھرتا ہے رنگِ نرگس و نسریں سے کھیلتا
رکھتا ہے بوئے زلفِ دوتا سے معاملہ
پر مفلسی وہ باتی ہے جب آن کر گلا،

گھر گھر کمانے پر بھی ہے مجبور آدمی
اے وائے آدمی
مجبور و دل شکستہ و رنجور آدمی
اے وائے آدمی

(۱۴)

جب عشق دیکھتا ہے کسی خوش خرام کو
جپتا ہے صبح و شام اُسی بُت کے نام کو
جی چاہتا ہے جائیے ہر شب سلام کو
اَن بن اگر ہوئی تو اُسی لالہ فام کو

ٹھینگا دکھانے پر بھی ہے مجبور آدمی
اے وائے آدمی
مجبور و دل شکستہ و رنجور آدمی
اے وائے آدمی

(۱۵)

خوددار و خودشناس و خودآگاہ ہے بشر
سنجیدہ و متین و خوش آداب و خوش گہر
پر دل میں اِحتیاج کا بجتا ہے جب گجر
تو سر بلا بلا کے طوائف کی پشت پر

طبلہ بجانے پر بھی ہے مجبور آدمی
اے وائے آدمی
مجبور و دل شکستہ و رنجور آدمی
اے وائے آدمی

(سنہ ۱۹۳۲ء)

مرگِ نَو

برسوں کے بعد آج یہ دل جاگ اُٹھا ہے کیوں

سینے میں ایک طرفہ تلاطُم بپا ہے کیوں

رُخصت کے وقت آج جھجک کیوں تھی اِس قدر؟

کیوں جلد مُڑ گئی وہ مراہات چھوڑ کر؟

آنکھوں میں رَس، نہ تیغِ تبسّم میں کاٹ تھا

الفاظ بے خروش تھے، لہجہ سپاٹ تھا

موجِ نفس میں آنچ نہ تھی سوز و ساز کی

رُخ پر تھی جھیل لِلائی ہوئی لَونیاز کی

اخفائے رازِ عشق کا تھا کیا یہ اہتمام؟

یا ہے قریبِ ختمِ جوانی کا عشقِ خام؟

دِل میں مرے اِک آنچ سی لیتی ہے کروٹیں

ناگن سی ایک رینگ رہی ہے دماغ میں

اِس سے تو جوش اِس امر پہ پڑتی ہے روشنی

یعنی سمجھ رہا تھا میں جس شئے کو "دِل لگی"

دِل کو چھپی "خراش" تھی، وہ دِل لگی نہ تھی

اک تازہ درد کی تھی چمک، چاندنی نہ تھی

سمجھا رہا ہوں دل کو، مگر مانتا نہیں

یہ سوءِ ظن تو عشق میں ہوتا ہے ہم نشیں!

دِل غالباً دوبارہ گرفتار ہوگیا
بیٹھے بٹھائے پھر وہی آزاد ہوگیا

(سنہ ۱۹۳۰ء)

عروس البلاد بمبئی

الا بمبئی خلدِ نوعِ بشر
نہیں تجھ میں ممنوع کوئی شجر

بہر سمت طغیانِ نظارہ
بہر گوشہ صد شوخِ مہ پارہ

بہر قطرہ گردابِ حسن و شباب
بہر ذرہ رقصندہ صد آفتاب

بہر بوستاں با ہزاراں خروش
خراماں نگارانِ گیسو بدوش

بہر گوشۂ چشم، مئے خانہ

بہر لغزشِ پائے، افسانہ

(۱۹۴۴ء)

سَراب

مری نظر نیشتر تھی جب تک

شباب سے بہرہ ور تھی جب تک

مری جبیں تھی گلاب جب تک

مرا لہو تھا شراب جب تک

شگفتہ تھی رسم و راہ تیری

مری طرف تھی نگاہ تیری

زباں پر ساز کی کھنک تھی

نگاہ میں سوز کی جھلک تھی

یہ منتیں تھیں کہ بس جلا لو

کنیز اپنی مجھے بنا لو

ہمیشہ آنکھوں پہ آستیں تھی

مرے قدم پر تری جبیں تھی

اور اب مجھے جانتی نہیں ہے

غضب ہے، پہچانتی نہیں ہے

تری نظر، اب نظر نہیں ہے

نظر میں برق و شرر نہیں ہے

فقط سن و سال پر فدا تھی؟

مرے خط و خال پر فدا تھی؟

جو عاشقی کی جبلّت پھرت تھی

مگر وہ اک شانِ جنسیّت تھی

یہ ہیں فقط شاعری کی باتیں

یہ ہیں فقط صوفیوں کی زیٹیں

کہ عشق ہے رُوحِ بے کرانی

کہ عشق ہے جنسِ آسمانی

مگر یہ اب پول کھل چکا ہے

کہ عشق ہیجان جسم کا ہے

نہ عشق اعلےٰ، نہ عشق احسن

فقط اک اعصاب کی ہے الجھن

نہ اب دوبارہ جوان ہوں گا

نہ اب ترا میہمان ہوں گا

کہ سنِ بہشت ہمیبری کا

مزار ہے رُوحِ عاشقی کا

شباب یہ داغ دے گیا ہے

تجھے بھی ہمراہ لے گیا ہے

مگر وہ دُنیا نہیں رہی ہے

مجھے بھی پروا نہیں رہی ہے

(سنہ ۱۹۳۸ء)

عورت

کرم آشنا ہے کہ سفاک ہے

بہر رنگ عورت خطرناک ہے

اگر جور پرور ہے اور تُند خُو

بہاتی ہے اہلِ نظر کا لہُو

اگر مہرباں ہے تو اے ہم نشیں

فنا کر کے مرنے بھی دیتی نہیں

جو بھاگیگا اِس سے اماں پائیگا

نہ بھاگا تو کم بخت پچھتائیگا

یاد کر

(۱۹۳۴ء)

یاد کر وہ دورِ گُل اے آفتِ جاں یاد کر
اپنا دامن یاد کر میرا گریباں یاد کر

جس کے ساغر رفشاں تھے جسکے ساحل گلفروش
وہ شبِ مہتاب و روزِ ابر و باراں یاد کر

جن کے جھونکوں سے لچکتی تھی اُمنگوں کی کمر
ابتدائے عاشقی کے وہ گلستاں یاد کر

جس کی ضَو سے جگمگاتا تھا شبستانِ مُراد
چاندنی میں اپنے ماتھے کی وہ افشاں یاد کر

کُشودِ کار

(۱۹۳۰ء)

پھر کُھلا جوشِ بابِ گفت و شنود
پھر ہوئے مست ساجد و مسجود
گاہ محمود وہ ہیں میں ہوں ایاز
گاہ وہ ہیں ایاز ، میں محمود
ہر روش پر ہے جوئے باغِ ارم
ہر قدم پر ہے بوئے عنبر و عود
ہر نفس میں ہے موجِ صد کوثر
ہر سخن میں ہے لحنِ صد داؤد

(۱۹۲۸ء)

اہلِ ملیح آباد سے

اپنے آبائی مکاں میں کل ہُوا میرا گزر

دل مرا اِس طرح دھڑکا، کانپ اُٹھے بام و در

آہ وہ چوکھٹ جُھکاتی تھی جہاں دُنیا جبیں،

آج اُس میں نام کو بھی منزلت باقی نہیں

آہ وہ ایوان، تھا جو سجدہ گاہِ خاص و عام

آج ہیں افسُردہ و آزُردہ اُس کے سقف و بام

مرکزِ جبروت تھی جو بارگاہِ بے مثال

آج اُس میں سازِ شوکت ہے نہ سامانِ جلال

حیف کل اک دیدۂ بینا تھا ہر گوشہ جہاں

آج آنکھیں بند ہیں ایک ایک ذرّے کی وہاں

انجمن تھی رات کے ہنگام شاد و تابناک

صبح کو دیکھا تو شمعیں تھیں نہ پروانوں کی خاک

اے عزیزانِ گرامی، اے رفیقانِ وطن

گھات میں اب آپ کی ہے سازشِ چرخِ کہن

گُل کھلانے ہی پہ ہے غفلت شعاری آپکی

کل تو تھی باری ہماری، اب ہے باری آپکی

اربابِ ادب! ہوشیار

(۱۹۴۰ء)

معاشرانِ طرب خانۂ ادب ہشیار
کہ آسمان نے پھر مشقِ ظلم جاری کی
بساط اُٹھاؤ بھی اے ماہرانِ شیشہ گری
کہ پھر گرج ہے گھٹاؤں میں سنگ باری کی
سنبھل کے سانس لو اے بستگانِ صبحِ نشاط
کہ بُو ہواؤں میں ہے شامِ سوگواری کی
بچاؤ موت سے لیلائے خام کاری کو
کہ پڑ رہی ہے بنا ذوقِ نخچہ کاری کی

چہرۂ برافروختہ (۱۹۳۰ء)

کل بارگہِ ناز میں میں نے یہ کیا عرض
بلبل، طلبِ گل میں ہے اِک عمر سے مضطر
پر کیا یہ غضب ہے، کہ کسی دور میں اب تک
بلبل کے ترانوں سے پسیجا نہ گلِ تر
یہ سُنتے ہی پیدا ہوئی رخسار پہ سُرخی
کچھ شرم کے انداز، تو کچھ غیظ کے تیور
رخسار کی سُرخی ہوئی پھر دھوپ میں تبدیل
وہ دھوپ چمکتی ہے جو تتلی کے پروں پر

سنہ ۱۹۳۰ء

ایک بے چین رات

ظلمتوں کا دبدبہ، بھیگی ہوئی تاریک رات
بدلیاں اُمڈی ہوئی، اُڑتا ہُوا رنگِ حیات
پردۂ تمکیں میں اک ناقابلِ فہم اضطراب
سینۂ ظلمت میں پُر اسرار یادِ ماہتاب
دل پر اک ناقابلِ تغییر بے معنی سا بار
ساعتِ بے عہد و پیماں لمحۂ بے انتظار
شمعِ کشتہ کے دھوئیں سا، ہزاروں پیچ و تاب
مطلعِ جاں پر اُبھرتا سا ہلالِ اضطراب

عشق کی ماری جوانی کو سُلانے کے لئے

کروٹوں پر کروٹیں وہ نیند آنے کے لئے

کروٹوں میں پرفشاں سوزِ محبت کے شرر

جیسے کرنوں کی چمک تیغ دودم کی دھار پر

(۲۶ فروری ۱۹۲۰ء)

محبّت کی زبان

الاماں اے ہم نشیں، اُس وقت کا بھی پیچ و تاب
دفعتہً جب کوئی آتا ہے برافگندہ نقاب

بجھ انوکھے سے نظر آتے ہیں اسبابِ حیات
دل کے سناٹے میں کھو جاتی ہے ساری کائنات

ڈالدیتی ہے سپر فکر آکے عقلِ نکتہ کار
عجز میں تبدیل ہو جاتا ہے دانش کا وقار

نطق کے ترکش میں ملتا ہی نہیں ہے کوئی تیر
بہترین الفاظ ہو جاتے ہیں نظروں میں حقیر

بند ہو جاتا ہے دروازہ زباں کا کانپ کر

خال و خط میں دل کی گویائی کا کھل جاتا ہے در

پھر تو اُن نظروں میں سوزِ عشق کرتا ہے خطاب

جن میں ہوتا ہے تپاں شوقِ کرم خوفِ عتاب

وہ جنوں پرور خموشی حال کرتی ہے بیاں

گفتگو کی آرزو بھرتی ہے جس میں سسکیاں

رنگِ رخ کو بخشتا ہے نطق دہ قلبِ دو نیم

کانپتا رہتا ہے جس پر سایۂ اُمید و بیم

اُن لبوں کی خشکیوں میں شوق کرتا ہے کلام

جن میں پیہم کر ڈیں لیتا ہے ذوقِ تشنہ کام

وَلوَلے اُس آتشِ پنہاں کو دیتے ہیں ہوا

رُخ پہ جن کی لَو، پہنتی ہے لباس الفاظ کا

اُس تبسّم کی زباں میں عشق کرتا ہے سخن،

جس کے تابندہ ورق پر غم کی موتی ہے شکن

چھیڑتی ہے پھر مسلسل اشک باری داستاں

ختم ہو جاتی ہے یوں اک پل میں ساری داستاں

سنہ ۱۹۴۴ء

کارل مارکس

السّلام اے مارکس، اے دانائے راز
اے مریضِ انسانیّت کے چارہ ساز

نخلِ خوشحالی کی بیخ و بُن ہے تُو
عقدہائے زیست کا ناخن ہے تُو

تجھ سے قائم دہر میں محنت کا حق
تجھ سے اَمرت، گرم ہاتھوں کا عرق

اے دبیرِ دہر و پیرِ حق پناہ
نشترِ فتّاد تیری ہر نگاہ

ملتیں تو میں اگر تیرا نظام

آج تلواریں نہ ہوتیں بے نیام

پھر بھی اِک عالم میں ہے تابندگی

تیری جانب مُڑ رہی ہے زندگی

اے کہ تجھ سے مبتلائے خلفشار

عُجب زر دار و غرورِ شہریار

اے کلیسہ قفلِ باب زنگ و نور

اے حکیم نو، کلیم تازہ طور

روئے بد مائی و آوارگی

اے طبیبِ علتِ بیچارگی

اے خطیبِ منبرِ فیضِ عمیم

اے ضیائے مشعلِ رزقِ کریم

خیر خواہِ جملہ اقوام و ملل

رازقِ بے قیدِ "ایمان و عمل"

ہاں علی الرغم نظامِ عرشِ پاک

اے دوا سے جملہ علتہائے خاک

اے پیامِ آبِ بہرِ تشنگاں

اے نویدِ ناں برائے خستگاں

اے گدائے راہ و شاہِ شش جہت

اے ابو الافلاس و ابنِ مرحمت

دشمن پیمانۂ پست و بلند

حامیٔ بیچارگانِ دردمند

آبگینے سے ترے سکتے ہیں سنگ

اے کہ تو اُترے ہوئے چہروں کا رنگ

اے کہ تُو جامِ سفالیں کا بہرم

اے کہ تُو سازِ شکستِ جامِ جم

اے کہ تُو برقِ سحابِ غم کشاں

اے کہ تو دردِ دماغِ خسرواں

اے کہ تُو "آہن شکن" آئینہ ساز

عارف "شاہیں" کُش و قمری نواز

اے کہ تیری ہر نگاہِ نکتہ یاب

صحتِ "ذات" و مرگِ "آفتاب"

ہمدمِ "شبیر" و برخواہِ "یزید"

موسیٰ نو بہرِ فرعونِ جدید

اے عدوئے "نوریانِ شعلہ خو"

اے انیسِ "خاکیانِ مُردہ رو"

اے رفیقِ خستگانِ بے نوا

ناخدائے بندگانِ بے خدا

اے نگاہِ بے نگاہانِ جہاں

اے کلاہِ بے کلاہانِ جہاں

مُنکرِ دارائی "عرشِ بریں"

اوّلیں پیغمبرِ فرشِ زمیں

ہند را آتش بہ جامے دادۂ

پائے شل را ہم خرامے دادۂ

روسِ تو رقصندہ و درخشندہ باد

زندہ و پائندہ و تابندہ باد

سحابِ سرود

سنہ ۱۹۳۱ء

ازل سے پیرِ مغاں کا ہے جوش یہ ارشاد

کہ تا ابد نہ رُکے جام، ہر چہ باد اباد

رفیق! کھول بھی دے بادبانِ کشتیِ شوق

سُبک ہے آبِ رواں چل رہی ہے بادِ مراد

خود آج حُسن ہے پابندِ عشق و عرفِ نیاز

خود آج عید کے قابو میں ہے دلِ صیاد

بہم ہے آتشِ سیّال و موجِ آبِ رواں

ہزار بار ترا شکر، جامع اضداد

اُٹھی ہیں جھوم کے کالی گھٹائیں قبلے سے
ہوئی ہے غیب سے زندان مست کی امداد

سحابِ حُسن سے رنگیں ہے روئے بیم و رجا
شرابِ عشق سے رقصاں ہے روحِ کون و فساد

فقیہِ شہر بھی ہے کارِ شرع سے فارغ
حکیمِ عصر بھی ہے بندِ فکر سے آزاد

ہر ایک پھول ہے، ساحل پہ رشکِ ساغرِ جم
ہر اک حباب ہے دریا میں فخرِ تاجِ قباد

بساطِ نغمہ نوازی ہے خاکِ نوحہ سرشت
محلِ راست روی ہے یہاں کجِ بنیاد

ہر ایک لحن ہے تفسیرِ نغمۂ داؤد

ہر ایک نقش ہے تصویرِ مانیٔ بہزاد

ورائے شرح و بیاں ہیں نزاکتیں جس کی

بیاضِ گل پہ رقم ہے وہ دل نشیں روداد

ہر اک کلی ہے جس میں گرہ کشائے رموز

ہر ایک گل ہے گلستاں میں صاحبِ ارشاد

ہر ایک حبادہ ہے آزردگی کا اک تعویذ

لکھے ہیں خاک پہ باراں نے وہ عجیب اعداد

سنا رہی ہے سرِ بزمِ قلقلِ مینا

نویدِ خاطرِ مجموع و مژدۂ دلِ شاد

ئے مے کدہ بھی آج ہے فیضِ مُدام

اَمیرِ سلسلہ صاحبانِ بَست و کُشاد

جھک رہی ہے ترانوں سے لیلیٰ مستی

چھک رہا ہے فسانوں سے عالمِ ایجاد

سنک رہی ہے تکلّف سے، زیرِ سایۂ تاک

نوائے نرم پہ طرزِ غزالۂ نوزاد

چھڑی ہوئی ہے سحر سے، میانِ بلبل و گل

حدیثِ ساعدِ شیریں و بازوئے فرہاد

اب و رنگِ سخن ہائے جوش ہے واللہ

راج تمہرِ شیراز ہے ملیح آباد

رُباعیات

(۱)

ممنوعِ شجر سے لطفِ پیہم لینے
عصیاں کی گھنی چھاؤں میں پھر دم لینے
آواز دو کاشمیر آ پہونچا جوش
اللہ سے انتقامِ آدم لینے

(۲)

یہ رات گئے عینِ طرب کے ہنگام
پرتو یہ پڑا پشت سے کس کا سرِ بام
"یہ کون ہے؟" "جبریل ہوں" "کیوں آئے ہو؟"
"سرکار افلک کے نام کوئی پیغام"

(۳)

یہ شامِ خنک، یہ ابرِ افسردہ خرام
ہستی کی نوید، اور نہ مستی کا پیام
گردوں پہ اِک آہ سی ہے لیکن موہوم
دل پر اک بوجھ سا ہے لیکن گم نام

(۴)

اُف سوزِ فراق کھائے جاتا ہے مجھے
ہر سانس میں چرکے سے لگاتا ہے مجھے
اللہ کبھی اِسے بھی آباد کرے
یہ سینہ جو خالی نظر آتا ہے مجھے

(۵)

"ہم دہر کے ناپختہ خیالوں میں نہیں"
"ہم سینۂ آگہی کے چھالوں میں نہیں"
حیرت ہے کہ ہر بھٹکنے والا انساں
کہتا ہے کہ "ہم بھٹکنے والوں میں نہیں"

(۶)

یہ نالۂ بے خروش، کس سے کہیئے
یہ قصۂ درد، جوش، کس سے کہیئے
مکھڑے کی دمک ہے، اور نہ لہجے کی کھنک
محرومیٔ چشم و گوش، کس سے کہیئے

(۷)

اے فتنۂ روزگار، واپس آجا
اے رونقِ لالہ زار، واپس آجا
ایسے میں کہ نو بہار ہے بادِ خزاں
اے دخترِ نو بہار، واپس آجا

(۸)

دل لیلیٰ افکار سے شرماتا ہے
اس نقص کو دیکھ کر گھلا جاتا ہے
فریاد کہ اس دورِ خرد میں بھی مجھے
بیتے ہوئے لمحوں کا خیال آتا ہے

(۹)

ہر آن رواں دواں ہے لیلائے حیات
بہتا ہوا دن ہے ، اور اڑتی ہوئی رات
یہ منتظر انتظار ، اے جانِ بہار
اور شہرِ گریزاں کے یہ نادر لمحات!!

(۱۰)

فریاد ہے عادل حیّ و قیوم
انسان ہے ہر لحظہ جہول ، اور ظلوم
دوزخ ہو ، برائے قادرانِ مجبور!
دوزخ ہو ، برائے عاصیانِ معصوم!!

(۱۱)

اِدراک کی خلوت میں مکیں ہے اب درد
بے پردہ نہیں، پردہ نشیں ہے اب درد
احساسِ مسرت سے ہُوں شاداں یعنی
ناقابلِ برداشت نہیں ہے اب درد

(۱۲)

عالم تیرا ہے، عیشِ عالم تیرا
کِھلتا ہے شگوفوں کی طرح غم تیرا
عیدِ مُفلس سے لاکہ بارائے منعم
ہوتا ہے شگفتہ تر محرم تیرا

(۱۳)

جب دِل نے کُتب کو خِضرِ راہ کیا
ہر حرف پہ غَور، حسبِ دل خواہ کیا
تو اُن میں سے بیشتر کتابوں نے مجھے
جہلِ اہلِ قلم سے آگاہ کیا

(۱۴)

مُفلس کا سُبو بھی سرخوشی کی توہین
مُنعم کے تلاطُم سے بھی پیدا تمکین
ظُلمت بردوش اُدھر ہے صُبحِ مولُود،
خورشید بکفِ ادھر ہے شامِ تدفین

(۱۵)

چھائی ہوا زلف کی خوشبو بن کر
ارماں بھی جاگے فضا میں جگنو بن کر
دیکھا جو ترے ہجر میں سوتے انجم
ٹپکی آنکھوں سے رات آنسو بنکر

(۱۶)

کیا شکر کہ ہر درد سہے درد بجا دید
ہر آن ہوائے شادی کی ہے ایک تازہ نوید

یہ خوں آلودہ چہرہ ہے کہ گیسوئے سرو

یہ جامِ صہبا لیے ہے کلاہِ جمشید

(۱۷)

ہست ہیں برگ و بار۔ واپس آجا
سرشار ہیں آبشار۔ واپس آجا
جھولوں کا یہ وقت، چھپکلوں کا یہ سماں
آئے گا نہ بار بار۔ واپس آجا

(۱۸)

اے دو جہاں سے بلند ہو جا للہ
اے موجِ الم، بلند ہو جا للہ
ہاں اے حرکتِ ہوش کے دل کی حرکت
کھلتا نہیں در تو بند ہو جا للہ

(۱۹)

نشّے میں بھی آہِ سرد بھرتا ہوں میں
لمحاتِ حیات میں بھی مرتا ہوں میں
اِس بات کی تُو گواہ رہنا شبِ غم
ہر گھونٹ پر اُن کو یاد کرتا ہوں میں،

(۲۰)

ہر غم، مئے مُل رنگ سے تھرّاتا ہے
آلامِ جہاں کا منہ اُتر جاتا ہے
لیکن جسے کہتے ہیں غمِ عشق اے جوشؔ
وہ نشّے میں کچھ اور بھی بڑھ جاتا ہے

(۲۱)

شرمائی سی ہے دراز دستی اب تو
سنولائی سی ہے لیلیٰ مستی اب تو
پچھڑی ہوئی دھوپ تھا لڑکپن اک دن
رکتی ہوئی سانس ہے جوانی اب تو

(۲۲)

دارائے محاسن کا یہ فیضانِ عیوب
ہر دل میں ہے طغیانیٔ صد عدوان و ذنوب
سرکارِ مشیت کی بدولت اب تک
ایک آدھ ہے معقول، تو لاکھوں مجذوب

(۲۳)

ہر لحن کی قسمت ہے کہ غوغا بن جائے
ہر نور کی فطرت ہے اندھیرا بن جائے
اس خمکدۂ امروز سے بھر لے جی کو
قبل اس کے کہ یہ گریۂ فردا بن جائے

(۲۴)

یہ زلف کہ ہے محیطِ رخسارہ و صدر
حلقوں میں لئے سیاہ ترشے ہوئے بدر
یا لیلیٰ ظلمت کا ہے تاجِ عنبر
یا حاملِ کیف و سرخوشی کی شبِ قدر

(۲۵)

نافوں کا مچلتا ہوا طوفاں ہے کہ زُلف
یہ تیرگیٔ چشمۂ حیواں ہے کہ زُلف
یا ظُلمتِ شب ہائے درازِ غم کا
بکھرا ہوا انبارِ جنباں ہے کہ زُلف

(۲۶)

یہ تُند ہوائیں، اور یہ زُلفِ دوتا
شبنم پہ ہے اضطرابِ گنگا جمنا
یُوں زُلف کے حلقوں میں بپا ہے ہلچل
دریا میں بھنور سے پڑ رہے ہیں گویا

(۲۷)

یہ زُلفِ دراز ہے کہ ساون کی نَدی
یا ابرِ سیاہ ہے سرِ سروِ قدی
یا خطِ شکست کی مچلتی سطریں
یا رشتۂ انفاسِ حیاتِ ابدی

(۲۸)

بادل میں یہ رُوئے ماہِ تاباں کیسا
ظُلمات میں یہ نُورِ شبستاں کیسا
حلقے میں لئے ہُوئے ہے رُخ کو کاکُل
یہ کفر کے زیرِ سایۂ قرآں کیسا

(۲۹)

گلشن پہ ہے زلفِ بے اماں کا پرتو
اور زلف پہ ابرِ گل فشاں کا پرتو
ٹکھڑے پہ ہے یوں سایۂ کاکل غلطاں
جس طرح یقین پر گماں، کا پرتو

(۳۰)

اللہ ری یہ زلف، مری مستِ شباب
ہر حلقہ شب رنگ ہے گویا گرداب
یا آتشِ رخ کا ہے یہ دودِ پیچاں
یا رندِ سیہ مست کا الجھا ہوا خواب

(۴۳)

ہر گام پہ جنبش میں ہے یہ زلفِ رسا
فوّارے سے یا اُبل رہی ہے صہبا
یا موجِ خرام کا اشارہ پاکر
شانوں پہ اُمنڈ آئی ہے گنگا کی گھٹا

(۴۴)

ظلمت سے ہوا بھگڑ رہی ہے گویا
بادل کی پری بچھڑ رہی ہے گویا
یوں موجِ صبا سے ہل رہی ہیں لٹیں
تاریک پھوار پڑ رہی ہے گویا

(۳۴۳)

زلفیں ہیں کہ ژولیدہ خیالات کی رات
اے جانِ حیا! ٹھہر بھی جا رات کی رات
ان تیرہ گھٹاؤں میں کدھر جائے گی
شانوں پہ سمٹتی ہے یہ برسات کی رات

(۳۴۴)

یہ سلسلۂ لامتناہی ہے کہ زلف
گہوارۂ بادِ صبح گاہی ہے کہ زلف

اے جمالِ شباب! عشق بےتاب ہے تیرے
ڈھلکی ہوئی رات کی سیاہی ہے کہ زلف

(۳۷)

کہتا ہوں ترے مُنھ پہ حقیقت تیری
مقصود نہیں اِس سے شکایت تیری
سلمٰی! وہ مرے شباب کا تھا پرتَو
میں جس کو سمجھتا تھا محبت تیری

(۳۸)

کوثر بے کیف ہو تو پانی بہتر
کج مج، ہو زباں، تو بے زبانی بہتر
مکروہ شمائل آشنا سے اے جوشؔ
آئینہ جبیں حدوئے جانی بہتر

(۳۵)

بچوں کا ہے اک کھیل مجاور ہونا
مشکل ہے مگر بہت مدبر ہونا
آسان ہے مومنِ مقلد بننا
دشوار ہے کافرِ مفکر ہونا

(۳۶)

صد حیف، تری وہ مہربانی نہ رہی
اک شے بھی بجز مرتبہ دانی نہ رہی
رہتی تری نظروں میں وہی بات اگر
غم مجھکو نہ ہوتا کہ جوانی نہ رہی

(۳۹)

کیا گوہرِ شاہوار ناسفتہ رہیں
داناؤں کے افکارِ حسن خفتہ رہیں؟
اے ہمتِ مردانہ! سخن ہائے دقیق
کیوں وحشتِ ابلہاں سے ناگفتہ رہیں؟

(۴۰)

کب تک [illegible] کشمکشِ جہت کا دھوکا
اُمت [illegible] اور [illegible] کا دھوکا

اے آدمِ خستہ مستِ الم و زاری!

تم کیسے غرورِ بشریت کا دھوکا!

عمر خیام کی ایک رباعی کا جواب ع ۔۔ از بے خودی علی ؟ گفتہ باشد"

(۴۱)

اے نوعِ بشر! عقدہ کشائے فردا
اے مشعلِ محرابِ سرائے فردا
مردانہ قدم اٹھا سوئے اوجِ کمال
اے بندۂ امروز و خدائے فردا

(۴۲)

شبنم سے نہ گل دھلیں تو میرا ذمہ
موتی نہ اگر رُلیں تو میرا ذمہ
اک در جو ہوا بند تو آئی یہ صدا
سو در نہ اگر کھلیں تو میرا ذمہ

(۴۳)

سو بات کی ہے یہ بات، آؤ سو جائیں
بدمست ہے خود حیات، آؤ سو جائیں
شبنم سے ہے چاندنی کا دامن نمناک
اب بھیگ چکی ہے رات، آؤ سو جائیں

(۴۴)

رہتا نہیں ہوش میں نظامِ اوقات
ہو جاتے ہیں غرقِ کیف و مستی لمحات
کھل جاتی ہیں جب تری گھنیری زلفیں
تو شام بھی بن جاتی ہے بھیگی ہوئی رات

(۴۵)

آجا، ہیجان میں ہیں دھارے، آجا
اِک شور ہے دریا کے کنارے، آجا
کلیوں پہ چمک رہی رَس کی بُوندیں
لہروں میں مچل رہے ہیں تارے، آجا

(۴۶)

کلیوں پہ اُدھر وفورِ مستی کے نکات
ہونٹوں پہ اِدھر مُصحفِ غم کے آیات
آمادہ مُصالحت پہ ہو گی کیوں کر؟
بھڑکی ہوئی یہ آگ، یہ بھیگی ہوئی رات

(۴۷)

ہر چند کہ رکھتا ہے روانی دریا
اُس پر بھی ہے غرقِ سرگرانی دریا
جاگیرِ گدا پہ ہے نگاہِ سلطاں
کوزے کا چٹخ رہا ہے پانی دریا

(۴۸)

ذہنی مردوں سے دل لگاؤں کیونکر
چلتی لاشوں کے پاس جاؤں کیونکر
مجرم ہو تو لاکھ بار کر لوں برداشت
احمق کا مگر بار اٹھاؤں کیونکر

(۴۹)

ہاں تیر چلا دیدۂ پُرنم کی طرف
ہاں بھیج قضا کو خشمِ شبنم کی طرف
امداد کا یہ وقت ہے اے ناخنِ مہر
صرف ایک کرن عقدۂ شبنم کی طرف

(۵۰)

کچھ لذتِ بحث جس کی صحبت میں نہیں
باتوں کا مزا اُس کی رفاقت میں نہیں
جو مختلف الخیال مجلس میں ہے لطف
وہ متحد الرائے جماعت میں نہیں

(۵۱)

ہر خوف کو زیر و پست کر کے نکلو
ہر نیست کو، گھر سے ہست کر کے نکلو
نکلو جو پئے شکارِ مرغ و ماہی
تو شیر کا بندوبست کر کے نکلو

(۵۲)

ظلمت میں چمک رہی ہے لفشاں جیسے
یا وقتِ غروب رنگِ بستاں جیسے
رخ پر ہے لٹوں سے جھٹ پٹے کا عالم
آلودۂ ابرِ صبحِ تاباں جیسے

(۵۳)

پلکیں ہیں کہ میکدے کے در کی دربان
آنکھیں۔ کہ دریچہ ہائے صبحِ خنداں
یا چہرۂ جوانی کے دمکتے تارے
یا جامِ بلوریں میں مُقیّد پریاں

(۵۴)

ہیجان میں ہے قہرِ الٰہی ہو گیا
غلطاں ہے اندھیرے میں تباہی گویا
اِن رات کی تیرگی، عیاذاً باللہ
زاہد کے ضمیر کی سیاہی گویا

(۵۵)

پستی میں بلندی کا اشارہ گویا
کہنے میں ہے صبح کا ستارا گویا
اس کارگہِ فتنہ میں یوں ہے شاعر
طوفان میں نوح کا سہارا گویا

(۵۶)

ہشیار ہو غم کشانِ جذبات پرست
دانا کی کی ہمت کبھی ہوتی نہیں پست
ہوتے ہیں تفکر سے مسلح جو دماغ
وہ لشکرِ دل سے نہیں کھاتے ہیں شکست

(۵۷)

ایماں کبھی کھل کے سانس لیتا ہی نہیں
کشتیٔ آبِ خرد میں کھیتا ہی نہیں
فریاد کہ افکار کی آزادی کا
مذہب کبھی لائسنس دیتا ہی نہیں

(۵۸)

انسان کب تک نہ صدرِ محفل ہوگا
کس روز بشر بالغ و عاقل ہوگا
قرنوں سے ہیں اربابِ نظر چشم براہ
کس دن یہ ہلال ، ماہِ کامل ہوگا ؟

(۵۹)

افسوس کہ اب بھی غم سے پانی ہے لہو
اب تک وہی ارتقاء کی ہے سُست نمو
حِکمت ہے، صباحِ نادمیدہ بہ اُفق
اِنسان ہے، حرفِ نارسیدہ بہ گلو

(۶۰)

قُدرت غیظ و غضب میں آئی کیا کیا
کی عقل نے اَنگشت نُمائی کیا کیا
مذہب گرنے لگا جب آئینِ حیات
انساں کی سرشت مُسکرائی کیا کیا

(۶۱)

مرتا ہے، مگر حیات ملتی ہی نہیں
دِل جس سے کھِلے، وہ بات ملتی ہی نہیں
تقلید ہے وہ وجہِ مفاسد جس سے
مُلّا کو کبھی نجات ملتی ہی نہیں

(۶۲)

ہاں شیخ[1] کا ہے جوہرِ اصلی دھوکا
دیتا ہے اُسے تو بس تسلّی دھوکا
کل رندِ تر و تازہ تھا، اَب زاہدِ خشک
وہ بھی دھوکا تھا، اَور یہ بھی دھوکا

[1] ایک تو زاہد کی طرف اشارہ ہے۔

(۶۳)

طاقت حملے کی جب چلی جاتی ہے
فطرت حیلے پہ دل کو اُکساتی ہے
ہو گر بہ کا عزمِ حج کہ حضرتؐ کی نماز
دونوں کے تصوّر سے ہنسی آتی ہے

(۶۴)

کیا مجھ کو گراں خواب سمجھ رکھا ہے
یا جوئے تنک آب سمجھ رکھا ہے
جنّاں کے ڈر سے ترک کر دوں گا شراب!
تُو نے مجھے نوّابؔ سمجھ رکھا ہے

ایک ہندِ ماضی و موئی حال کی جانب اشارہ ہے ۔ اصلی نام کے عوض "نواب" استعمال کیا گیا ہے ۔

(۹۵)

ہاں دل کو رہینِ بادہ خواری کر لے
رگ رگ میں طرب کی نہر جاری کر لے
اللہ رے فتنہ ہائے بیداریٔ ہوش
دانا ہے اگر تو خواب طاری کر لے

(۹۶)

دل آن پہ نہ یوں نثار کرتا اے کاش
خود کو نہ زبوں و خوار کرتا اے کاش
بہتر تھا کہ دوزخ پہ بھروسا کرتا
جنت کا نہ اعتبار کرتا اے کاش

(۶۷)

بدخواہِ پیمبر نہ کہیں ہو جاؤں
باں منکرِ داور نہ کہیں ہو جاؤں
انساں کی تباہی کا تماشا کر کے
ڈرتا ہوں کہ کافر نہ کہیں ہو جاؤں

(۶۸)

کچھ بھی نہیں عالم میں بجز بدحالی
خود گڑ گیا، نیو جس نے گہری ڈالی
یہ دہر ہے بازار کی گالی گویا
سننے کو جو مڑ گیا، اسی نے کھالی

(۶۹)

درماندہ و بے نوا ہوں، حیراں ہوں میں
المختصر اک مردِ پریشاں ہوں میں
ساعی ہوں کہ "آمد" سے ہم آہنگ ہو "خرچ"
رومال کے اوڑھنے میں کوشاں ہوں میں

(۷۰)

مخلص نہ سہی ظلم کا بانی تو نہ بن
شمشیرِ عناد کی روانی تو نہ بن
کرتا نہیں احسان کا اقرار، نہ کر
محسن کا مگر دشمنِ جانی تو نہ بن

(۱۷)

یہ عشق ہے، آسودہ نگاہی کے لئے
یہ راست روی ہے کج کلاہی کے لئے
تم کو اپنے سے بڑھ کے رکھتا ہوں عزیز
لیکن اپنی ہی خیر خواہی کے لئے

(۱۸)

ہر یارِ جفا جو کو نبھا ہی میں نے
سمجھا سرِ زخمِ دل کو پھاہا میں نے
لیکن اپنے سے بڑھ کے اب تک واللہ
دنیا میں کسی کو نہیں چاہا میں نے

(۷۳)

اِک جنس کا میلان ہے اور کچھ بھی نہیں
اِک جسم کا ہیجان ہے اور کچھ بھی نہیں
اے مردِ خدا رُوح سے کیا عشق کو کام
یہ خون کا ارمان ہے اور کچھ بھی نہیں

(۷۴)

سوئے ہوئے فتنوں کو جگا دیتی ہے
جاگے ہوئے ذہنوں کو سُلا دیتی ہے
جس قوم کے اعصاب پر عورت ہے سوار
وہ عقل سے عشق کو بڑھا دیتی ہے

(۷۵)

جُرعات سے دِل کے داغ دھوتی اے کاش
خُشکی میں سفینہ نہ ڈبوتی اے کاش
دو بُوندوں نے اَور آگ لگا دی دل میں
پیمانے میں اک بُوند نہ ہوتی اے کاش

(۷۶)

خُوں خوار کو پروان چڑھانے والے
کمزور کو خاک میں ملانے والے
شاہیں بھی ہے کیا تیری ہی ایجادِ لطیف
مَعصُوم کبوتر کے بنانے والے؟

(۷۷)

ہر صبح ہے اک عجیب سودا مجھ کو
ہر شام ہے اک طرفہ تقاضا مجھ کو
جگ بیت گیا مگر یہ اب تک نہ کھلا
آخر کس شے کی ہے تمنا مجھ کو

(۷۸)

ہر آہ کی لَو ، زمزمہ کاری نکلی
ہر برق کی رَو ، بادِ بہاری نکلی
آنکھوں سے گزر گئی جب اشکوں کی سپاہ
ہونٹوں پہ تبسّم کی سواری نکلی

(۷۹)

شانوں پہ ہے چھٹکی ہوئی زُلفوں کی لٹک
اعضا میں ہے تازہ شاخِ گُل کی سی لچک
اور اُس پہ یہ انگڑائی کا عالم کہ نہ پوچھ
بکھری ہوئی بدلیوں میں جس طرح دھنک

(۸۰)

شیون کو عجیب سوز بخشا میں نے
تاروں کو سرشکِ غم بنایا میں نے
جب رات کو آنسوؤں کی چلمن سے ندیم
مہتاب کو مسکرا کے دیکھا میں نے

(۸۱)

پروانہ کریں گے تازہ آنے والے
دو دن میں بھلا دیں گے زمانے والے
گلزار سے اے بہار جاتی ہے تو جا
اب ہم بھی ہیں عنقریب جانے والے

(۸۲)

اے چشمۂ لالہ زار، دم بھر تو ٹھہر
ابرِ سرِ کوہسار، دم بھر تو ٹھہر
اک آبلہ پا، دواں ہے تیری جانب
اے قافلۂ بہار، دم بھر تو ٹھہر

(۸۳)

اے شبنم تازہ اپنے گلشن کو بچا
اے یخ کدۂ حیات، خرمن کو بچا
وہ آئی مرے لب پہ دہکتی ہوئی آہ
اے لیلیٰ ز مہر، دامن کو بچا

(۸۴)

انسان رہے گا مبتلائے آلام
پل بھر کو بھی حاصل نہیں ہوگا آرام
ہر آن دھڑکتے ہوئے دل کے منہ میں
جب تک کہ دماغ کی لگے گی نہ لگام

(۸۵)

پھر ڈال دی اُس نگار نے غم کی طرح
پیمانہ ہے پھر دیدۂ پُرنم کی طرح
آئی برسوں میں مثلِ نُورِ انجم
اور آ کے گئی قطرۂ شبنم کی طرح

(۸۶)

ہونگے محرُوم ہر نظارے سے کبھی
بن جائیں گے ٹُوٹے ہوئے تارے سے کبھی
تم بھی تھے ہمارے سے کبھی اہلِ قیُود
ہم بھی ہو جائیں گے تمہارے سے کبھی

(۸۷)

گفتار میں کھل رہی ہے بیلے کی کلی
رفتار میں مڑ رہی ہے ساون کی ندی
چہرے پہ سُرور و نور، آنکھوں میں غرور
سرکار نے کیا آئینہ دیکھا تھا ابھی؟

(۸۸)

اے دل، ضائع نہ کر بہ انعامِ فلک
اِس لمحۂ خوش میں خوب جی بھر کے دمک
یہ بحر پہ طیارۂ عاجل کا ہے عکس
یہ نہر میں ہے شہابِ ثاقب کی چمک

(۸۹)

جو دِل کی ہے، وہ بات نہیں ہوتی ہے
جو دِن نہ ہو وہ رات نہیں ہوتی ہے
ہستی ہے وہ طوفان کہ اکثر اے جوشؔ
اپنے سے مُلاقات نہیں ہوتی ہے

(۹۰)

پہنچاتی صبا زُلف کی خوشبو بنکر
ارماں بھاگے فضا میں جگنو بن کر
دیکھا جو ترے ہجر میں سوئے انجم
ٹپکی آنکھوں سے رات آنسو بنکر

(۹۱)

مطبوعِ مسائل کا لگاتا ہے سُراغ
محرابِ تمنّا میں جلاتا ہے چراغ
افسوس کہ اِک عُمر میں جا کر یہ کھُلا
دِل کا اِک نکتہ رَس مصاحب ہے دماغ

(۹۲)

اسرار کو میزان میں تولا نہ گیا
موتی تھے یہ وہ کہ جن کو رولا نہ گیا
خود کھُل گئی عمر کی کمانی افسوس
اور عُقدۂ کائنات کھولا نہ گیا

(۹۳)

جیسے پیماں نباہتا ہے کوئی
خود پر روؤں، یہ چاہتا ہے کوئی
جب شام کو میداں میں سنکتی ہے ہوا
میرے دل میں کراہتا ہے کوئی

(۹۴)

ہشیار ہو اے گروہ صاحب نظراں
غفلت کا محل نہیں جہانِ گذراں
پل بھر بھی یہاں پلک جھپک جانے میں
ہوتا ہے ہزار ہا مناظر کا زیاں

(۹۵)

اے عمرِ رواں کی رات آہستہ گزر
اے ناظرِ کائنات آہستہ گزر
اک شے پہ بھی جمنے نہیں پاتی ہے نگاہ
اے قافلۂ حیات، آہستہ گزر

(۹۶)

طوفاں کے ہیں جھٹ پٹے کی رو میں آثار
میداں ہے تا حدِ نظر تیرہ و تار
گردوں پہ گرج رہی ہے پُر ہول گھٹا
گلشن میں لرز رہی ہے پودوں کی قطار

آوارہ خیالات

یہ جانِ زار کہ پامالِ خستہ حالی ہے
کمینہ پیشِ کشِ بندگانِ عالی ہے

نازاں ہُوں تجمّل پر جلوؤں کو نمایاں کر
مدّت سے پریشاں ہُوں، اک دن تو پشیماں کر

تشنۂ مرگ ہے جہاں، زہرِ فنا کا جام دے
نرگسِ نیم باز کو رخصتِ قتلِ عام دے

باغ میں ابر ہے، اور ابر میں رُوحِ طوفاں
میرے پہلو میں بھی اے دخترِ طوفاں آجا

یُوں آج تیرہ رات میں گرمِ خروش ہُوں
گویا کوئی جہاں میں نہیں ہے مرے سوا

عالِم کو گاہے گاہے جائز ہے بادہ خواری
عارِف کے واسطے ہے شربِ مُدام ساقی

آج پھر بیدار میرے دِل میں اُن کی یاد ہے
اے زمیں فریاد ہے، اے آسماں فریاد ہے

کِس طرح قُربِ یار پہ شُکرِ خُدا کروں
اب بھی ہے دِل میں کوئی تمنّا سی، کیا کروں

قافلۂ شوق، اُٹھ، آئی وہ بانگِ رحیل
سازِ طرب، راہ بر، لرزشِ صہبا دلیل

ظُلمت کی رُونمائی کو کچھ نُور چاہیئے
رونے کو بھی تو خاطرِ مسرُور چاہیئے

جب سے جویائے حقیقت کر دیا
شعر کو ہم نے عبادت کر دیا

دیکھ جاؤ کہ ہوش آیا ہے
پھر ہماری خبر نہ پاؤ گے

دونوں جہاں کو لے کے دیا ایک مے کا جام
رحمت خدا کی ساقیٔ ارزاں فروش پر

این نکتہ را نداند ہر کس کہ نزد عاشق
صد عشرتِ دو عالم، یک فرصتے نگاہے

گو رہینِ شکستہ حالی ہوں
شاہِ اقلیم خوش مقالی ہوں

واہے دَرِ تبسّم ہر نیم وا کلی میں
دیوانہ ہو رہا ہوں جنگل کی چاندنی میں

نہیں جہاں میں کوئی اَسیر فقیروں کا
کہ بے نیاز بہت ہے خدا امیروں کا

رَس کی بوندیں پڑ رہی ہیں، تا کجا یہ پیش و پس
ہم نشیں، ساغر اُٹھا، اللہ بس، باقی ہوس

میری یوسف شناس نظروں میں
ذرّہ ذرّہ ہے مصر کا بازار

اپنے جلووں کو پا رہی ہے نگاہ
کیا میسّر ہُوا ترا دیدار؟

اَب اور جو رشبِ انتظار کیا ہوگا
یہ اِبتدا ہے تو پایان کا کیا ہوگا

نُور بھی ہجر میں اَفسُردہ ہے ظُلمت بھی اُداس
صبح رِنداں کی قسم ، شامِ غریباں کی قسم

بہت ہیں آب و رنگ رُوئے تاباں دیکھنے والے
بہت کم ہیں عیارِ نازِ خوباں دیکھنے والے

جگر ، موتا ہے کیونکر جام سے سیراب ، کیا جانیں
یہ ناقص طینتانِ منبر و محراب ، کیا جانیں

جب ذکر تمہارا چھڑتا ہے جب یاد تمہاری آتی ہے
رہ رہ کر اس سینے میں اک ناگن سی لہراتی ہے

آوارۂ کوچۂ بتاں ہوں
سلطانِ زمین و آسماں ہوں

بخش کر یاروں کو ساقی نے سرِ جامِ سفال
ہمکو چھانٹا خدمتِ جامِ جہاں بیں کے لئے

وقت آیا ہے کہ اب بیدار ہو اے انقلاب
زندگی بے چین ہے تجدیدِ آئیں کیلئے

شکستہ ہونگے رباب کیا کیا، تباہ ہونگے شباب کیا کیا
چلیں گے پیری کے وار کتنے، مگر زمانہ جواں رہے گا

پلک جھپکنے میں ایک برچھی نظر کے اٹھنے میں ایک خنجر
یہی اگر عشوہ کاریاں ہیں تو کوئی بچ کر کہاں رہے گا

وطن میں آغازِ شاعری نے کہا تھا یادش بخیر مجھ سے
یہی اگر نغمہ باریاں ہیں چمن میں کیا آشیاں رہیگا

ہوئی یہ یک بیک کس سے ملاقات
کہ خود اپنے کو یاد آنے لگا میں

مسکراتی ہوئی یوں آئیں وہ مے خانے میں
رُک گئی سانس چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

آگ رکھ دو تو برف ہو جائے
آہ بھر دو تو حرف ہو جائے

وقت کی دولتِ بیدار سے جو زخم کہن
بھر چلا تھا اُسے پھر آج صبا چھیڑ گئی

لہ رفیق جریٹر کی تعریف میں

چلی آج ایسی خنک ہوا کہ کسی کو یاد دلا دیا!
جو دیا تھا دل میں بجھا ہوا اسے ہائے پھر سے جلا دیا

ندیم آ، کہ وہ رنگیں زمانہ یاد کریں
وہ عیشِ صبح و وہ کیفِ شبانہ یاد کریں

پوچھتے کیا ہو جوشؔ کی حالت
اب کی بچتے نظر نہیں آتے

دل کی پامالی پہ نادان کو ترس کھانے بھی دو
روکنے سے فائدہ؟ ناصح کو سمجھانے بھی دو

جس شئے کو دیکھتا ہوں طوفانِ رنگ و بو ہے
یہ کون مجھ سے، یارب، اسرارِ گفتگو ہے

شب کو آنکھیں لڑیں ہوئے خاموش
صبح دیکھا تو راز افشا تھا

ہائے کس صورت سے حسن و عشق کو یکجا کروں
حسرتو! کیوں کھائے جاتی ہو مجھے میں کیا کروں

ایسے چپ تو کبھی نہ تھے تم جوشؔ
سچ بتاؤ یہ ماجرا کیا ہے

نوعِ انساں کو میسّر ہی نہیں ہوتا کمال
آہ کس معمار کی یہ حسرتِ تعمیر ہے؟

فغاں نہیں یہ اثر ہے دل میں خوشی کی پنہاں ترین جس کا
ہنسی نہیں۔ یہ ترے جگر میں خفیف سی اک خراشِ غم ہے

انہیں اوقات میں پڑتی ہے طرحِ بزم افروزی
فدائے رنگِ ابرِ بہمنی و بادِ نوروزی!

وہاں شر سے نہ کیوں اُمید رکھیں خیر و خوبی کی
جہاں اے جوش ہوتے ہیں جواہر سنگ سے پیدا

اُفق تھا حُسن کا دُھندلا طلوعِ عشق سے پہلے
یہ رنگینی ہوئی میرے شکستِ رنگ سے پیدا

ادب سے دیکھ چمن میں بہارِ پھولوں کی
چمک رہی ہیں یہ پیشانیاں رسُولوں کی

حسین جھُول رہے ہیں برنگِ ابرِ بہار
رواں ہے خُونِ حنا ڈوریوں میں جھُولوں کی

بڑھا ہی تھا میں سوئے گل کہ دفعتہً اے جوش
مرے سلام کو شاخیں جھکیں ببولوں کی!

گویا سرِ کہسار مچلتی ہوئی بدلی
اُس شاہدِ بدمست کی رفتار تو دیکھو

اے ان آراستہ زلفوں کے اثر سے غافل
تو نے پرزے نہیں دیکھے ہیں گریبانوں کے

اب خواب ہیں وہ عہدِ تمنا کی لذتیں
جب آہِ نیم شب سے جگر روشناس تھا

ضو فگن یوں روئے جاناں ہو گیا
چاند کا دھبا نمایاں ہو گیا

فسونِ برہمیٔ ابرِ شامِ تنہائی
نہ مجھ سے پوچھ، کہ آنکھوں میں رات کاٹی ہے

کروٹوں کی نذر ہو جاتی ہیں راتیں ہجر کی
اُن گھنی پلکوں کی موجِ خواب افشاں کی قسم

تلخیٔ حق کی قسم نشیں! اسو گند
صبر بھی تلخ ہے شراب بھی تلخ

پہلو میں یارِ سادہ، آنکھوں میں موجِ بادہ
اے جوشؔ اللہ اللہ کیا پاک بازیاں ہیں

ہمنشیں! خاک کے پردے میں چھپ جاؤں گا میں
روئیں گے برسوں زمین و آسماں میرے لئے

نگینہ ہے کہ آنسو، فیصلہ کرنے سے ڈرتا ہوں
چمک پر جب حیاتِ عارضی کی، غور کرتا ہوں

اِس مری آتشِ غم کو نہ سمجھ کربِ عظیم
نارِ نمرود میں ہے گل کدۂ ابراہیم

بغیر نام لئے آپ کا ، اگر میں نے
شراب پی ہو تو گویا حرام شئے پی ہو

مجھ سے کیا شکوہ اے سرابِ جمال
مجھ کو میری ہی نگاہ نے مارا

کیفِ تکمیلِ یاس کی سوگند
طربِ گاہ گاہ نے مارا

ہر آن کھیلتے رہے گو موت ہی سے ہم
مایوس ہو سکے نہ مگر زندگی سے ہم

اے آسمان! تجھے خدا کا نہیں ہے خوف
ڈرتے ہیں اے زمین! ترے آدمی سے ہم

تم نہیں ہو تو زندگانی ہے
شام ہے بیمار و صبح بادہ گسار

دل ہوا اتنا خوشی سے ہمکنار
روح کو احساسِ غم ہونے لگا

گونجتی پھرتی ہے آفاق میں بھوکوں کی صدا
کون اللہ کو کہتا ہے کہ رزّاق نہیں؟

میں شہریارِ گل ہوں، شہنشاہِ لالہ ہوں
شکرِ خدا کہ مستِ شرابِ وفا ہوں

مسکرائے ہی جا ہے صبحِ وصال
شکوۂ طولِ شبِ ہجراں نہ کر

خمِ کاکل میں گرفتار ہوں، دل شاد ہوں میں
شکرِ معبود کہ ہر قید سے آزاد ہوں میں

فغاں کہ یار کو کیفِ شبانہ یاد نہیں
فسوں تھا جس پہ فدا وہ فسانہ یاد نہیں

زمیں جس سے خروشاں تھی، آسماں رقصاں
وہ جوشِ بربط و چنگ و چغانہ یاد نہیں

مچل رہی تھی دو عالم کی داستاں جس میں
وہی مکالمۂ محمدانہ یاد نہیں

خواب میں جب تک کہ ہے پیغمبری ہے زندگی
اور اگر بیدار ہو تو داوری ہے زندگی

لبِ گل رنگ کو آزردۂ فریاد نہ کر
بن پڑے تو مجھے اب بھول کے بھی یاد نہ کر

تجھ کو ان نیند کی ترسی ہوئی آنکھوں کی قسم
اپنی راتوں کو مرے ہجر میں برباد نہ کر

بال الجھے ہوئے، لب خشک، نگاہیں مایوس
حسن پر اتنا ستم اور ستم ایجاد نہ کر

زمانے میں کس درجہ بے دست و پا ہے
ترے عشق سے جو مسلح نہیں ہے

اے ابر، جا کے کہنا اُس جانِ آرزو سے
چبھتی ہے پھانس دل میں اب تو گلوں کی بو سے

صبح ہوتی نہیں طلوعِ جہاں
دل کی بستی اب ایسی بستی ہے

دل ہے اُس سطحِ غم پر اب قائم
نہ بلندی ہے اور نہ پستی ہے

نشے میں بھی برستی ہیں آنکھیں
کتنی بے کیف مے پرستی ہے

شہرِ دھلی کے ذرّے ذرّے پر
ہائے کیا بیکسی برستی ہے

اب تو اے جانِ جاں، مری ہر رات
نیند کے واسطے ترستی ہے

اب یہ عالم ہے زندگانی، کا
جس پہ اے جوش، موت ہنستی ہے

پھر جنوں سلسلہ جنباں ہے، خدا خیر کرے
پھر نظر، سوئے گریباں ہے، خدا خیر کرے

یہ کنارِ چمن، یہ ابرِ بہار
ایک طوفاں سا ہے یمین و یسار

کس کس طرح کی دل پہ ہے آفت ، نہ پوچھیے
غم پیشگانِ عشق کی حالت ، نہ پوچھیے

شمس و قمر ، ثوابت و سیار جن و انس
کس کس کی قلب میں ہے محبت ، نہ پوچھیے

آ کے بزمِ عیش میں بیٹھے بھی تو یوں آ کے ہم
اپنی شمعِ زیست کے دونوں سرے سُلگا کے ہم

نہ جانے رات کو رندوں میں کیا تھی گفت و شنود
کہ سیلِ نور میں دامن فشاں تھا شب کا جمود

نوائے کیف سے تھی یوں فضائے شب لرزاں
ہوا میں صبح کو جس طرح شمعِ کشتہ کا دود

ہر ایک حرف میں کون و مکاں کی پہنائی
ہر ایک سانس میں صد نغمہ ہائے لامحدود

کشتیٔ مے[1] کو حکمِ روانی بھی بھیج دو
جب آگ بھیج دی ہے، تو پانی بھی بھیج دو

یہ ہجومِ بے قراری، دلِ بیقرار کب تک
گلۂ فراق تا کے، غمِ انتظار کب تک

نہ گلوں کے منہ پہ رونق، نہ کلی کے لب پہ سرخی
اِس اَلم نصیب رُت میں سرِ نو بہار کب تک

آئیں وہ، اور میں نہ تھا موجود
یوں دعائیں قبول ہوتی ہیں

[1] آپ بھیجنے والے نے شراب بڑی دیر میں، بار بار طلب کرنے کے بعد بھیجی تھی، لیکن سوڈا اس کے ساتھ ارسال نہ کیا تھا جب یہ شعر اس کے پاس روانہ کیا گیا تو اس نے سوڈا بھی بھیج دیا۔

دِل کے لِئے شرارِ جہنم سے کم نہیں
وہ حرفِ آرزو جو زباں سے ادا نہو

سازِ طرب ہے دِل کے لِئے سوزِ ناتمام
اے آہِ نارسائیِ محبّت! رسا نہو

حُسن! اپنی رہ گزر کا وہ ذرّہ دکھا مجھے
جس سے جبینِ شوق مری آشنا نہو

رُخ پہ سُرخی، نگاہ میں بچپن
زندگی کے لباس میں گلشن!

جوش میں نے کب کیا تھا اِدّعا اِسلام کا
شیخ کو کیوں اتنی کاوش ہے مری تکفیر میں

ہر صبح کے بعد، شام ہے آخر کار
ہر شبنم و گل ہے منزلِ برق و شرار
ہر خوابِ شباب میں ہے بیداریٔ شیب
فریاد ہے اے عَرَبَدۂ لیل و نہار

اے رفتۂ شباب اب ہوں کتنا پامال
افسوس محبت کا یہ ہونا تھا مآل
اک شہر میں رہ کر بھی، جدائی صد حیف
اک بزم میں بیٹھ کر بھی محرومِ جمال

اللہ رے جبہِ ہمنشینانِ کبار
کتنی نظریں مری نظر سے ہیں دوچار
ہر چند کہ ہے پیشِ نظر مصحفِ دوست
آنکھوں کو نہیں پھر بھی مجالِ دیدار

پارے کی طرح چڑھ کے اُترنے والی
اے جوش کے سائے سے بھی ڈرنے والی
اللہ کرے خوشی نہ بھاگے تجھ سے
صحبت سے مری گریز کرنے والی

اب رُعبِ جمال مجھکو آزار نہ دے
عاشق ہے وہی، جان کی بازی جو بدے
ہاں وہ کوئی آگیا، برافگندہ نقاب
اے جُرأتِ یک نظر، خُدا را مَدَدے

ہر وقتِ سکوں کو اذنِ عشرت جانو
ہر نیمِ نفَس کو ایک دولت جانو
مُستقبل و ماضی ہیں اُسے لجھنے والو!
اِس لمحۂ نقد کو غنیمت جانو

اے اختر خوش جمال و اے ماہ جمیل
اے تو کہ ترا نظیر کوئی ، نہ عدیل
جتنا کہ حقیر کر چکی ہے اب تک
بندے کو اب اُس سے بڑھ کے کرنا ذلیل

گونین کی ہر آگ کو کجلاتا ہے
آفاق کے ہر نُور کو دُھندلاتا ہے
مہتاب میں دھبے ہیں، گلوں میں کانٹے
بدبیں کو بس اِتنا ہی نظر آتا ہے

پھر تازہ فساد، مے کے اوقات میں ہے
پھر سازشِ نَو، اہلِ مُناجات میں ہے
سرمایۂ صد داغِ جگر ہے اے جوش
وہ رخنہ کہ دیوارِ خرابات میں ہے

پہنا کے وفا نے آگ مالا ہم کو
سانچے میں نئے سوز کے ڈھالا ہم کو
اپنا ہی نہیں، دِل میں ہے دشمن کا بھی درد
اس چیز نے اور مار ڈالا ہم کو،

کیا خوف، اگر دَورِ فلک ہے دشمن
تلوار کو کاٹتی ہے میری گردن
طُوفان تو بادباں ہے کشتی کا مری
آندھی تو مرے چراغ کا ہے رَوغن

حاصل ہے ہر اِک بلا سے رِندوں کو فراغ
ہر آگ کا گرداب ہے مہکا ہُوا باغ
موجِ طُوفاں کو ہم بناتے ہیں جہاز
طاقِ صَرصَر میں ہم جلاتے ہیں چراغ